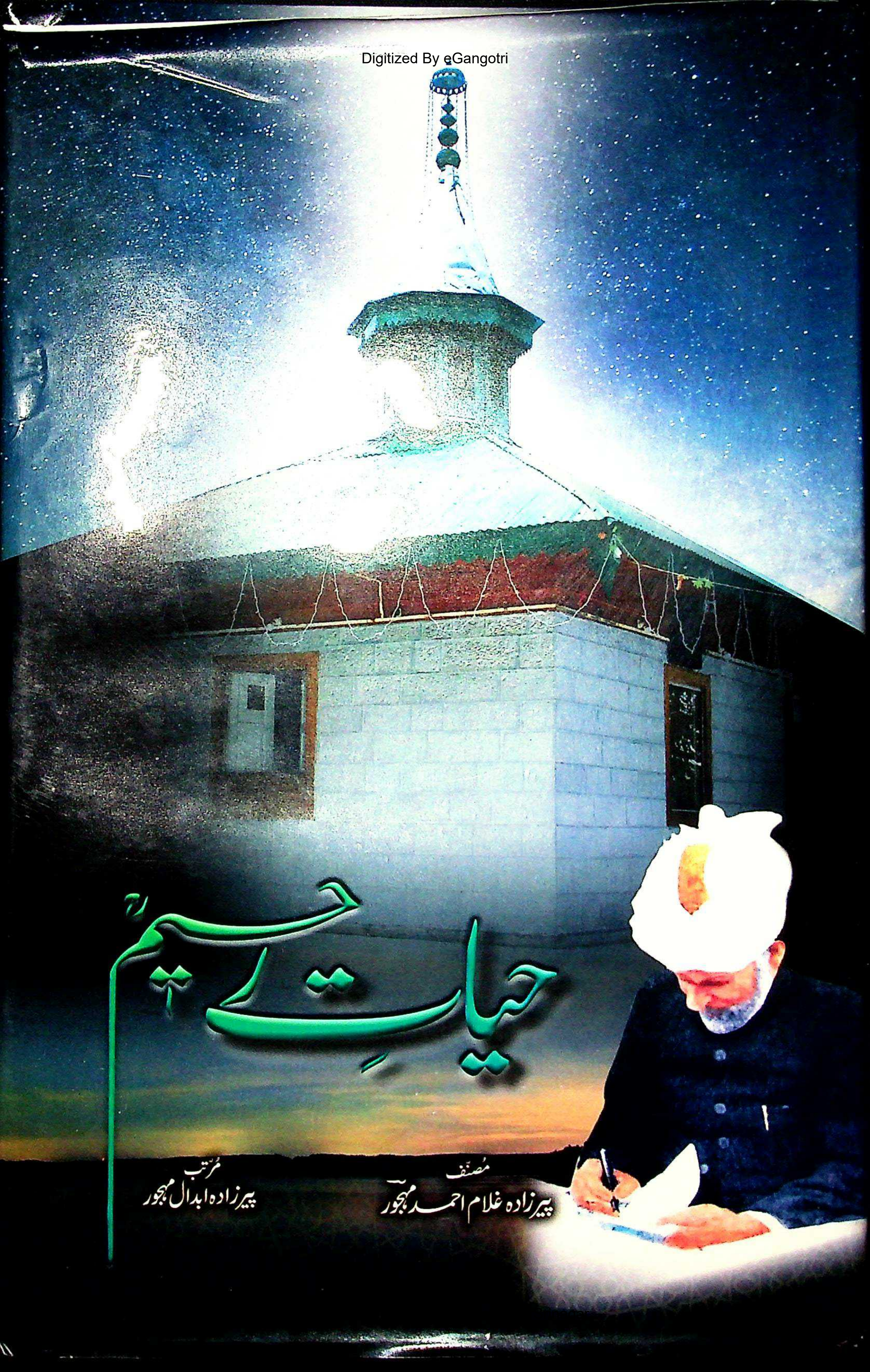
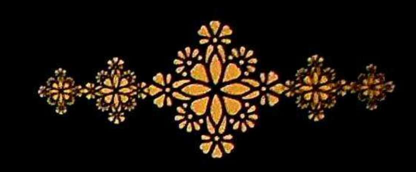


حیاتِ رحیم
مُصنف
پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ
مُرتب
پیرزادہ ابدال مہجور



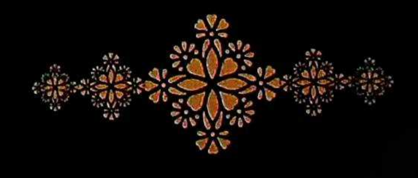
حامداً ومصلیّاً مرحوم محترم پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ وادیٔ کشمیر کے ہردلعزیز شاعر، ادیب اور سخن دان، نکتہ سنج شخصیت کا نام ہے۔ آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے علمی اوصاف کے ساتھ ساتھ خدا شناسی، خدا ترسی، انساں پروری اور احترامِ آدمیت کے روحانی اقدار سے بھی سرفراز کیا تھا۔ یہ آپ کے آثار میں درج نظم ونثر بیانات سے واضح ہے ؎

عاشقان را دین و ایمان یاد دوست
بہتر از ذکر و عبادت نام اوست
ذکر دِلبر قوتِ جان حرز تن است
زین سبب عاشق زِ ہر غم ایمن است

آپ نے جذبۂ عشق اللہ کی تحریک سے وقت کے نامور فقیر، خدادوست، ولی کامل، محرم اسرارِ یزدانی، وارثِ فیوضیات شاہبازِ لامکانی جناب شاہ عبدالرحیم صاحب صفاپوری المعروفِ بادشاہ رحیمؒ صاحب کی مقدس سبق آموز حیات وسیرت اختصاراً تحریر فرمائی۔

میں نے اس تحریر کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی ادبی واخلاقی شیرینی سے محظوظ ہوا۔ مجھے اُمید واثق ہے جو اس تحریر کو خلوص وآدابِ مطالعہ کے ساتھ مطالعہ کرے گا وہ ضرور سلوک اور اہل سلوک سے محبت کرے گا اور سمجھے گا کہ معرفتِ الٰہی انسان اور بنی نواع انسان کے ساتھ ساتھ انسانیت کا عظیم اور مرکزی مقصد حیات ہے۔ جو عاشق ہے، عارف ہے وہی حقیقتاً یہاں بھی زندہ ہے، اُسی کی زندگی جاویدانی اور فرحت بخش ہے۔

پروفیسر میر سیّد محمد طیّب کاملی
پرنسپل اورینٹل کالج جامعہ مدینۃ علوم
حضرت بل، سرینگر
امام وخطیب خانقاہ نقشبندیہ
خواجہ بازار، سرینگر



هُوَالرَّحِیمُ

حیاتِ رحیمؒ

یعنی

حالاتِ زندگی

تاج الاولیاء سُلطانُ الفقراء، بادشاہِ بحروبر

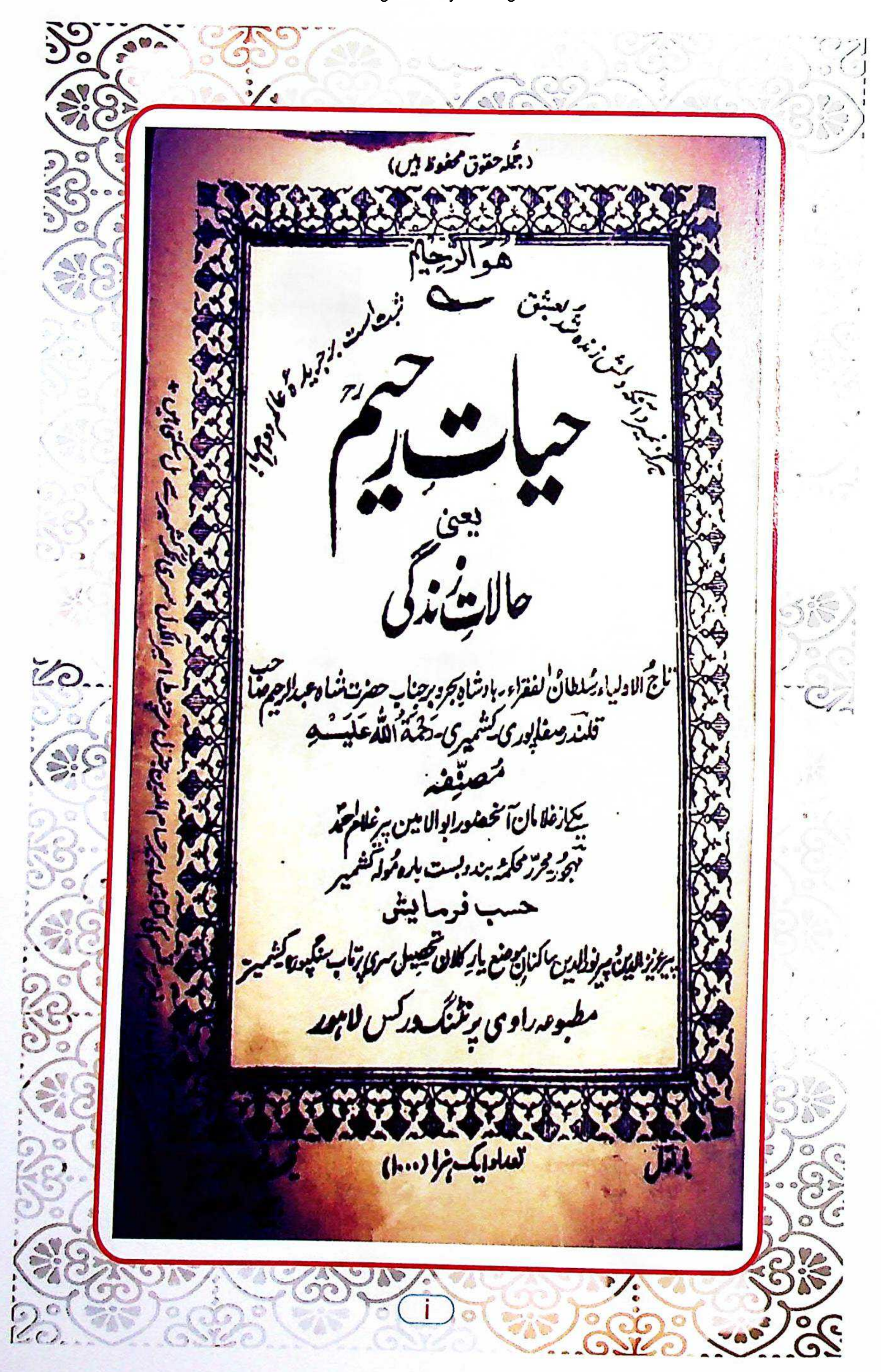
جناب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قلندرؒ صفاپوری، کشمیری رَحْمَةُ اللهِ عَلَیْهِ

مُصنّف:

یکے از غلامان آنحضور ابوالامین پیرزادہ غلام احمد مہجور

مُرتّب:

پیرزادہ ابدال مہجور



ھو الرحیم

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حیاتِ رحیمؒ

یعنی

حالاتِ زندگی

تاج الاولیاء، سلطان الفقراء، بادشاہ بحر و بر جناب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب
قلندر صفاپوری کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

مصنفہ
یکے از غلامان آنحضور ابوالامین پیر غلام احمد
مہجور محرر محکمۂ بندوبست بارہ مولہ کشمیر

حسب فرمایش
پیر عزیز الدین و پیر نور الدین ساکنان موضع یار کلان تحصیل سری پرتاب سنگھپورہ کشمیر

مطبوعہ راوی پرنٹنگ ورکس لاہور

بار اول   تعداد ایک ہزار (۱۰۰۰)

ISBN : 978-93-80691-54-9

نامِ کتاب	:	حیاتِ رحیمؒ
مصنف	:	پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ
اشاعت اوّل	:	1917-18ء
اشاعت دوم	:	2019ء
مُرتّب اشاعت دوم	:	پیرزادہ ابدال مہجور
معاون	:	اسرار الحق
قیمت	:	-/650 روپے
تعداد	:	1000
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	عادل آسماعیل، ضمیر احمد اندرابی، بوستان احمد شاہ
سرورق	:	Pixel Media
فوٹوگراف سرورق	:	۱۔ آستانِ عالیہ حضرت سُلطان الفُقر اءرحیم شاہ صاحبؒ صفاپور ۲۔ پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ
ناشر	:	جموں و کشمیر مہجور فاؤنڈیشن
کتاب ملنے کا پتہ	:	میزان پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بٹہ مالو، سرینگر

7006773403/9419031082

اِنتساب

حکیم الاُمّت، شاعرِ مشرق حضرت علّامہ اقبالؒ کے نام

جو حضرت مہجورؔ کو ادبیاتِ کشمیر پر

تصنیف و تالیف کا سلسلہ

جاری رکھنے کی تاکید کرتے رہے

خاکسار

پیرزادہ ابدال مہجور

شاعرِ کشمیر حضرت مہجورؔ کے نام
شاعرِ مشرق حضرت علاّمہ اقبالؔ رح کا پوسٹ کارڈ

مکرمی!

اسلام علکم

حیاتِ رحیم کے لئے سپاس گذار ہوں۔ میں نے اس کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کشمیر اور کشامرہ کے متعلق آپ اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھیں گے بالخصوص کشمیری شعراءؔ کے تذکرے کی طرف جلد توجہ کیجئے۔ فقط

محمد اقبال، لاہور

۶/اپریل ۱۹۲۳ء



حکیم الامت شاعرِ مشرق علاّمہ اقبالؒ کے خط کا عکس،

جوانہوں نے ''حیاتِ رحیم'' کے مطالعہ کے بعد شاعرِ کشمیر حضرت مہجورؔ کو ارسال کیا تھا

فہرست عُنوانات

نمبر شمار	عُنوان	صفحہ نمبر

باب اوّل

باب دوم

باب سوم

باب چهارم





باب اول

نذر

نیاز مند اِس کتاب کو سچّی عقیدت سے اپنے مُربّی و مُحسن قبلہ وکعبہ جناب حضرت پیر غیاث الدین شاہ صاحب مدظلّہ العالیٰ متوطّن موضع یارِ کلاں کے نام نامی واسمِ گرامی سے معنون کرتا ہے، جن کو حضرت اَقدس کے خلیفۂ خاص ہونے کا فخر حاصل ہے۔

گر قبول اُفتد زِہے عزّ و شرف

خاکسار

پیرزادہ غلام احمد مہجور

پیرزادہ ابدال مہجور

حرفِ آغاز

محترم قارئین! یہ انتہائی مسّرت کا مقام ہے کہ آج ہم پورے سو سال بعد شاہ عبدالرحیم قلندرؒ صفا پوری کی حیاتِ مُبارکہ اور اُن کے رُوحانی کشف وکمالات پر پیرزادہ غلام احمد مہجور کی تحریر کردہ تصنیف ''حیات رحیم'' کی اِشاعت کا دوسری بار اہتمام کرنے میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور دربار رحیمی کی عظمت وفضیلت کے طُفیل کامیاب ہوئے ہیں۔ آمین۔ آپ اندازہ کریں کہ سو برس پیشتر مہجور صاحب نے قیامِ بارہمولہ کے دوران انتہا درجہ کی مالی مشکلات کے باوجود اس کتاب کی اشاعت کو عملی جامہ پہنایا۔ حالانکہ اُس زمانے میں یہاں کے اہلِ علم ودانش کے لئے کسی کتاب کو چھپوانا بہت کٹھن ہوا کرتا تھا۔ قدم قدم پر مصنف کو کئی بار لاہور یا امرتسر جانا پڑتا تھا۔ ساڑھے چار روپے ماہانہ تنخواہ پانے والے ایک پٹواری کے لئے یہ کام کتنا مشکل اور ناممکن تھا آپ اِس کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ تاہم اپنے محسنوں اور چند قریبی رشتہ داروں کی حوصلہ افزائی اور مالی معاونت سے مہجور صاحب

اِس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے جس کا ذکر اُنہوں نے کتاب کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ بہت ہی قلیل تعداد میں چھپنے کے باعث کتاب چند ہی برسوں میں نایاب ہوئی اور اِس کی نایابی دربار رحیمی کے عقیدت مندوں اور فدائین کیلئے باعثِ اضطراب ثابت ہورہی تھی۔

دراصل حیات رحیم ایک بلند مرتبت اور برگُزیدہ قلندر کی صرف سوانح حیات ہی نہیں بلکہ اس میں کئی صدیوں پر محیط کشمیر کی عظیم الشان رُوحانی میراث اور صُوفی روایات کا عکس بھی ہمیں نظر آتا ہے۔ مہجورؔ صاحب نے کتاب کی تمہید میں خطۂ کشمیر کی رُوحانیت اور صُوفی روایات کے تاریخی پس منظر پر سیر حاصل بحث کی ہے، جو یقیناً تاریخی اہمیت کی حامِل ہے۔ تاہم کتاب کے تازہ ایڈیشن کی اِشاعت کو جدید تقاضوں اور تصورات سے ہم آہنگ کرنے کا مقصد بھی زیرِ نظر رکھنا ہمارے لئے لازمی تھا۔ کیونکہ بیسویں صدی کی ۶۰ / اور ۷۰ / کی دہائیوں میں اِسلام اور عقیدہ کے تعلق سے کچھ نئی تاویلیں اور تشریحات وارِدِ کشمیر ہوئیں۔ اگر چہ اِن نظریات اور تشریحات سے یہاں کے عوام نے کسی حد تک ذہنی طور پر اتفاق کیا لیکن یہاں کی روحانی میراث اور عقیدوں کو جذباتی طور پر ہمیشہ عزیز تر رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ حیات رحیم کی اہمیت، اِفادیت اور عظمت آج کے مادّی دور میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کتاب کے اِس پس منظر کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق اجاگر کرنے کے پیش نظر ایک مقدّمہ تحریر کرنے کی ضرورت شدّت سے محسوس ہوئی۔ ہماری اِس خواہش کو وادیٔ کشمیر کی بلند مرتبت دینی و

علمی شخصیت حضرت مولانا شوکت حسین کینگ صاحب نے پورا کر کے ایک مدلّل اور مفصل مقدّمہ عنایت فرمایا جس کیلئے ہم محترم مولانا صاحب کے ممنون ہیں۔ ہماری رائے میں کشمیر کی ادبی تاریخ میں بھی حیات رحیم کا ایک اہم مقام ہے جس پر اِظہارِ خیال کیلئے محترم مولانا صاحب نے محترم محمّد یوسف ٹینگ کا انتخاب کیا اور اُنہوں نے حسب توقع حیات رحیم کے نادر و نایاب تاریخی اور ادبی گوشوں پر روشنی ڈال کر بہت دلچسپ اور شاندار تمہید تحریر کر کے عنایت فرمائی، ہم اُن کے بھی بے حد مشکور ہیں۔ غور طلب ہے کہ مہجور صاحب نے حیات رحیم میں نالۂ مہجور کے عنوان سے مولانا رومی کی مثنوی کے طرز پر حضرت اقدسؒ کی شان میں فارسی زبان میں پچاس اشعار پر مشتمل نذرانۂ عقیدت تحریر کیا ہے۔ ہمارے اِصرار پر کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر شاداب ارشد نے نالۂ مہجور کے فارسی اشعار کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ قارئین حضرات کی رہنمائی اور مطالعہ کیلئے ان اشعار پر ایک مفصل اور مدلّل تنقیدی جائزہ تحریر کیا جو قارئین گرامی کیلئے واقعی سودمند ثابت ہوگا۔ ہم ڈاکٹر شاداب صاحب کے بھی مشکور ہیں۔ کشمیری زبان کے معروف شاعر، ادیب اور نقاد محترم منشور بانہالی نے اوّلین فرصت میں حیات رحیم کے ثقافتی اور روحانی پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے فکر انگیز جائزہ عنایت فرمایا۔ ہم اُن کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

قارئین گرامی! جیسا کہ ہم نے آغاز میں ذکر کیا ہے کہ حیاتِ رحیم صرف حضرت اقدسؒ کی حیاتِ مبارکہ ہی نہیں بلکہ اِس میں انیسویں صدی

کی آخری دہائیوں اور بیسویں صدی کے اِبتدائی دور میں کشمیری مسلمانوں کی زندگی کے سماجی، معاشرتی، اِقتصادی اور مالی حالات کی تلخ حقیقت کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ کشمیری عوام کی زبوں حالی اور مطلق العنان حکمرانوں کے تظلمات کی دِلخراش داستان بھی رقم کی گئی ہے۔ اس دور میں قحط پڑنے سے دیہات میں بُودوباش کرنے والی پوری آبادی کا نام و نِشان مٹ جاتا تھا۔ حضرت اقدسؒ کے مسکن صفا پورہ میں قحط کا ذکر کرتے ہوئے مہجور صاحب یوں رقم طراز ہیں:

"۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۵ھ میں جبکہ حضرت سلطانُ الفُقرا کی عمر شریف ۳۹ سال تھی۔ خطہ کشمیر میں سخت قحط پڑا جِس سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ بے شمار خلقت ننگ و ناموس اور حُبِ وطن کو خیر باد کہہ کر دور دراز ممالک میں چلی گئی۔ اکثر ماؤں نے اپنے پیارے بچے نہایت بیدردی سے راستوں میں چھوڑ دئے جو کسمپرسی کی حالت میں پیکِ اجل سے ہم آغوش ہوگئے۔ بیشمار لوگ غذا میسر نہ ہونے کے باعث عام راستوں اور گذرگاہوں پر تڑپ تڑپ کر جانیں دیتے تھے۔ کفن دفن تو ایک طرف لاشوں کو وہاں سے کوئی اُٹھانے والا نہیں تھا۔ حضرت اقدسؒ ہر چیز کو خدا کی راہ میں خیرات کرتے تھے۔ ایّامِ قحط میں یہ طریقہ زیادہ مستحکم ہوا۔ عام مسافروں اور مِسکینوں کو کھانا کھلانے سے جب فارغ ہوتے

تھے تو درختوں سے میوے اتار کر بھوکوں کو کھلایا کرتے تھے۔

اِس عہد کے اکثر اشخاص ابھی زندہ ہیں جن کا بیان ہے کہ جب حضرت اقدسؒ کسی درخت پر میوہ اتارنے کے لئے چڑھ جاتے تھے تو درخت کے نیچے بھوکوں کی بھاری تعداد جمع ہوتی تھی۔ چونکہ قحط کی شدّت نے لوگوں کو اِس قدر پامال کر دیا تھا کہ کسی میں درخت پر چڑھنے کی ہمّت اور طاقت نہیں تھی۔ اِس کے برعکس خداوندِ کریم نے حضرت اقدسؒ کو ایسی ہمّت بخشی تھی کہ ایک لمحہ کیلئے بھی خدمتِ خلق اللہ سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔ مِسکینوں اور بھوکوں کی سیر شِکمی سے کسی قدر اِطمینان اور فراغت حاصل کر کے گاؤں کے اِردگرد گشت کرتے تھے۔ ملاحظہ یا عام دریافت پر اگر کسی مردہ مسافر کی لاش مل جاتی تھی تو فوراً اُس لاش کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اپنے گھر لاتے تھے اور اُس کو غسل دیتے تھے۔ اور اگر لاش ننگی ہوتی تھی تو اپنا کوئی کپڑا کفن کے عِوض اِستعمال کر کے بعد از نماز جنازہ اپنے گھر کے متصِل ایک جگہ دفن کر لیا کرتے تھے۔ اِس کام میں بھی کسی دوسرے شخص نے اِن کی معاونت نہیں کی۔ قبر میں داخل کرتے وقت ہر مسافر کے ساتھ وعدہ کرتے تھے۔ اِنشا اللہ ءُ المُستان دنیائے ناپائیدار سے کوچ پر میں بھی تمہارے ہی پہلو میں دائمی گوشہ نِشینی اِختیار کرونگا۔ اِس قسم کے تقریباً پچیس مسافر

انہوں نے اپنے دستِ مبارک سے سپردِ زمین کیئے۔ آخر جب
اِس دار فانی سے رہگرائے عالمِ جاوِدانی ہوئے تو حسبِ وعدہ
اسی قافلے کے پڑوس میں شبِ آخرت بسر کرنے کیلئے جگہ
حاصِل کی"۔

حضرت اقدس کی زندگی کے آخری برسوں میں پورے یورپ میں پہلی عالمگیر لڑائی شروع ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ خطۂ کشمیر اِس جنگ سے براہ راست متاثر تو نہیں ہوا لیکن لڑائی میں شامل ہونے کے لئے رنگروٹ بھرتی کرنے کا حکم جاری ہوا۔ مہجورؔ صاحب حضرت اقدسؒ کی رحلت کے بعد کشمیر میں ابتری کے آثار نمودار ہونے کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

"کشمیر میں رنگروٹوں کی بھرتی کا مرحلہ پیش آیا تو اہلِ
کشمیر جنگی اہلیت نہ رکھنے کے باعث سخت تشویش میں پڑ گئے
اور انہوں نے اِس طرزِ عمل کو مرگِ ناگہانی سے زیادہ
خطرناک تصور کیا۔ کشمیر کے ہر ایک گاؤں سے بحیثیتِ مجموعی
ایک ایک رنگروٹ مانگا گیا۔ چونکہ اپنی رضامندی سے کوئی
شخص جانا نہیں چاہتا تھا اِس لئے نمبر داران و سرکش
زمینداران نے گاؤں کے کسی غریب اور غیر کاشتکار ڈوم یا
چمار کو کچھ رقم دیکر گاؤں کی طرف سے جانے پر آمادہ
کر دیا۔ اگرچہ والدین اِن کی مفارقت پر ہزار ہزار آنسوں
بہاتے تھے مگر شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ مسٹر اے۔ ایم۔ سٹو

صاحب بہادر کمشنر بندوبست کشمیر، جب ایک دفعہ علاقۂ لار تحصیل خاص کے بھرتی شدہ رنگروٹوں کا ملاحظ فرمانے کے لئے ملہ شاہی باغ میں بسواری موٹر تشریف لے گئے تو ان کو حدودِ شہر سے نِکل کر راستے کے دونوں طرف قدم قدم پر برابر ملہ شاہی باغ تک جو سرینگر سے ۱۰ ار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ضعیف العمر عورتیں اور ناتواں بوڑھے، گریاں و نالاں نظر آئے۔ اہلِ کشمیر کو معلوم ہی تھا کہ حکومت کی طرف سے جبریہ بھرتی کا کوئی حکم نہیں ہے۔ مگر اپنے ناعاقبت اندیش بھائیوں کے جبریہ طریقہ سے ان کو پائے گریز نہ تھا۔ عام لوگوں نے اسی لئے اِس بھرتی کا نام رضامندی بِالجبر رکھا تھا۔ اِس رضامندی بِالجبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں غریب نوجوان نمبرداران وغیرہ کے بیجا دباؤ سے ایسے ڈر گئے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے وطنِ عزیز کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور غیر ممالک میں جا کر اپنے والدین اور عزیز واقارب کیلئے زندہ درگور ہو گئے۔ اِدھر باشندگانِ دیہہ ان سختیوں میں مبتلا تھے اُدھر اہالیانِ شہر کو غلّہ کی کمیابی بلکہ نایابی نے پریشان کر دیا۔ راقم کا چشم دید واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک سرکاری کشتی پر ایک غریب آدمی ایک روپیہ کی شالی لینے کیلئے آیا۔ ایک بے رحم چپراسی نے اس کو لاٹھی سے مارا۔ مگر اُس نے اُف تک نہ

کی۔ ہوش سنبھال کر پھر شالی والی کشتی کی طرف دوڑا۔ سِیاہ دِل چپراسی نے پھر وہی سلوک کیا۔ وہ بیچارہ مار کھا کر کسی قدر وقفہ کے بعد پھر شالی کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر افسوس ہے کہ سنگدل چپراسی اپنی وحشیانہ حرکت سے باز نہ آیا۔ آخر میں میں نے اُس ستم زدہ کو ایک طرف لیجا کر سمجھایا کہ یہاں تم کو شالی نہیں ملے گی۔ کیوں ناحق اپنی بے عزّتی کروا رہے ہو؟ اُس نے بچشم اشکبار جواب دیا کہ چار دِن سے ایک روپیہ کی شالی لینے کے لئے یہاں آرہا ہوں مگر کچھ نہیں مِلتا۔ اُدھر میرے چھوٹے بچے چار دِن سے متواتر بھوکے ہیں۔ اُن کی آہ و پکار نے مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ یہ حال تو اُن لوگوں کا تھا جو اندر باہر نکل سکتے تھے۔ ناتواں لوگوں، معذوروں، ضعیف العمر، بوڑھوں اور پردہ دار عورتوں کا حال تو کسی صورت میں قابلِ تحریر نہیں۔ اِس طرح باشندگانِ کشمیر جن دنوں قحط میں مبتلا تھے خاص اُنہی ایّام میں ہیضہ (کالرا) کی بیماری بھی نمودار ہوئی۔ اِس نے قحط سے بڑھکر اپنا کام کیا۔ لوگ پہلے ہی نیم مردہ تھے۔ ہیضہ نے سینکڑوں خاندان بے چراغ کر دیئے۔ اور نیم مردہ قوم کو بلکل بے جان کر دیا"۔

آخر میں ہم حیاتِ رحیمؒ کی روحانی عظمت اور تاریخی اہمیت

و اِفادیت کے حوالے سے اِس تصنیف کے چند اِمتیازات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

قارئین! کئی معتبر ذرائع سے تصدیق ہونے کے بعد اِس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہم کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ حیاتِ رحیمؒ کسی کشمیری مصنِف کی اُردو میں تحریر کردہ پہلی سوانح حیات ہے۔ اِس لحاظ سے سو سال پرانی یہ تصنیف کشمیر سے اردو ادب کی تاریخ میں ایک بے مِثال دین ہے جس کیلئے مہجورؔ صاحب کا نام اردو دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ اِس تصنیف کا دوسرا اِمتیاز یہ ہے کہ کشمیر کے ممتاز دانشور، بلند مرتبت شخصیت، ماہرِ تعلیم اور جموں و کشمیر یونیورسٹی کے بانی حضرت خواجہ غلام احمد عشائی نے حیاتِ رحیمؒ کے بنیادی مسودہ کو گہری دِلچسپی سے پڑھا اور اِس کی صحت و ترتیب میں مہجورؔ صاحب کی بھرپور مدد کی۔ حیاتِ رحیم کا تیسرا اِمتیاز یہ ہے کہ علامہ اِقبالؒ نے جِس عظیم شخصیت کو مُجدّدِ کشامرہ کا خطاب دیا ہے ہماری مراد محقّق و مورخِ کشمیر مرحوم جناب مُنشی محمّد دین فوقؔ صاحب سے ہے، انہوں نے عدیم الفرُصتی کے باوجود ''حیاتِ رحیمؒ'' کے مسودہ پر نظرِ ثانی فرمائی اور اِس کی طباعت و کتابت کا اہتمام اپنے ذِمہ لیا۔ اِس تصنیف کے چوتھے اِمتیاز کے حوالے سے آپ یقیناً مسرور ہونگے۔ جب حیاتِ رحیمؒ لاہور سے چھپ کر آئی تو مہجورؔ صاحب نے اوّلین فرصت میں کِتاب کی ایک کاپی حکیم الامّت شاعرِ مشرق علامہ اِقبالؒ کی خدمت میں باپتِ مطالعہ بذریعہ ڈاک اِرسال کی۔ لگ بھگ دو ماہ بعد یعنی اپریل میں مہجورؔ صاحب کو لاہور سے علامہ

اِقبالؒ کا ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا، جس پر یہ چند الفاظ رقم ہیں:

"حیاتِ رحیم کیلئے سپاس گذار ہوں۔ میں نے اِس کتاب کو بہت دِلچسپی سے پڑھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کشمیر اور کشامرہ کے متعلق آپ اپنی تصانیف کا سِلسِلہ جاری رکھیں گے بِالخصوص کشمیر کے شعراء کے تذکرہ کی طرف جلد توجہ کیجئے۔

فقط: محمّد اِقبال لاہور

قارئینِ گرامی! آپ اندازہ کریں کہ شاعرِ مشرِق علامہ اِقبالؒ کے مبارک ہاتھوں میں اِس کِتاب کی ورق گردانی ہوئی، یہ اِمتیاز اپنے آپ میں ایک تاریخی واقعہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج ہم اِس سوانح حیات کے دوسرے ایڈیشن کو جو بہت ہی دِلکش پیرائے میں چھپا ہے آپ کے ہاتھوں میں سونپ کر اِنتہائی خوشی اور فخر محسوس کر رہے ہیں۔ آمین۔

یہ غازی یہ تیرے پُراَسرار بندے
جنھیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم اِن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سِمٹ کر پہاڑ اِن کی ہیبت سے رائی

❀❀❀

اِظہارِ تشکر

''حیات رحیمؒ'' کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی جستجو اور فکر اگر چہ ہمیں گذشتہ کئی دہائیوں سے دامنگیر تھی تاہم نامسائد حالات اور کچھ ذاتی پریشانیوں کے سبب یہ کام تاحال التواء میں رہا،لیکن اس عظیم کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہمارے خاندان کے معزز بزرگوار اور دوست و احباب ہر وقت اور ہر روز مجھے دعاؤں، رہبری، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی صورت میں متواتر تحریک دیتے رہے۔ میں اِن سب معززین کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اِن کے اسمائے گرامی درج کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتا ہوں:

مرحومہ دادی صاحبہ مہتاب بیگم اہلیہ حضرت مہجورؔ، پیر عبدالعزیز الدّین شاہ صاحب ابن پیر حضرت غیاث الدّین شاہ صاحب، والدِ مرحوم پیرزادہ محمّد امین ابن مہجور، مرحوم پیرزادہ رشید احمد مہجور، پیر بشیر الحق، پیرزادہ عبدالاحد شاہ، پیرزادہ عبدالباری مہجور (جنہوں نے سرورق پر شائع مہجورؔ

صاحب کی نایاب تصویر کو قابلِ اشاعت بنایا)، پیرزادہ خالد احمد مہجور، پیرزادہ وحید احمد شاہ، پیر قمر الدّین، پیر نظام الدّین مخدومی، اسرار الحق، ڈاکٹر شاداب ارشد، انجان کشمیری، نذیر احمد اندرابی رنتی پوری، بوستان احمد شاہ، غلام نبی بٹ صفاپورہ، علی محمّد بٹ صفاپور، بشیر احمد بٹ متولی صفاپورہ، عادل اسماعیل، نثار نسیم اور دربار رحیمی کے دیگر معتقدین و مریدان۔

بصد خُلوص و احترام

پیرزادہ ابدال مہجور

مولانا شوکت حسین کینگ

مقدّمہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نحمدہٗ و نُصلی و نُسلِمُ علیٰ رسولہٗ الکریم

امابعد

اسلام ایک مکمل ضابطہ و نظامِ حیات کا دوسرا نام ہے۔ اس نظام حیات کا تعلق باذاتِ حضرت اللہ جل جلالہٗ اور ذاتِ اقدس حضرت خاتم النبیین جناب احمد مجتبیٰ محمّد رسُول اللہؐ کے ساتھ ساتھ ربُّ العالمین کی جملہ مخلوقات خاص کر بنی نوع انسان کے ساتھ بفحوائے ارشاد باری وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بنی اٰدَمَ کے تناظر میں نہایت ہی عمیق ہے۔ اسی لیے حضرت پیغمبر آخر الزمانؐ رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث ہوئے اور آپؐ محسنِ انسانیت ہونے کے ناطے ہر صباح شہادت کا فریضہ ان جامع الفاظ میں ادا فرماتے

تھے: اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ رَبَّ کُلِّ شَیْءٍ اَنَا شَھِیْدُ اَنَّ الْعِبَادَ کُلُّھُمْ اِخْوَةٌ

(ترجمہ) اے اللہ ہمارے رب اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں (یا) میں گواہ ہوں اس پر کہ سب بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(حزب الاعظم لامام مُلا علی قاری الہروی المکیؒ)

ایضاً

جامع الشواہد از مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

حضورِ پرنورؐ سے جب ایک دفعہ استفسار کیا گیا کہ دین کی جامع تعریف کیا ہے تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: (۱) العظمۃ للہ (۲) والشفقۃ علیٰ خلقِ اللہ۔

یعنی دین، عظمت الٰہی کے تصور و عقیدہ اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات پر شفقت کا نام ہے۔ عظمت الٰہی کا کامل تصور اور شفقت علی خلق اللہ کی دولتِ بے بہا اُس مومن کو نصیب ہوتی ہے جو عقیدہ و عمل کے بعد مرتبہ ''احسان'' جس کو عرفِ عام میں روحانیت و تصوف کے نام سے موسوم کیا گیا ہے پر فائز ہوتا ہے۔ اور ان خوش نصیب لوگوں کو قرآن و حدیث کی اصطلاح میں محسنین کا نام دیا گیا ہے۔ اُم الاحادیث معروف بہ حدیث جبرئیلؑ میں حضرت پیغمبر اسلامؐ نے جوامع الکلم کے الفاظ میں اسکی بسیط شرح بیان فرمائی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اور سورۃ التعلیم یعنی سورۂ فاتحہ (مقدمۃ القرآن) میں ان حضرات کو اہل انعام کا نام دیا گیا ہے جس کی وضاحت آگے تفسیر القرآن بالقرآن کے طور سورۂ النساء میں بیان کی گئی ہے اور مندرجہ ذیل چار گروہوں کو سرفہرست رکھا گیا۔

(۱) انبیاء کرام (۲) صدیقین (۳) شہداء (۴) صالحین۔

اور یہ سب اہل ولایت ہیں۔ یعنی قرب الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے انتہائی قریب ہیں۔ البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انبیاء کرام کی ولایت اُن کا خاصہ ہے اور یہ سب سے افضل ولایت ہے؛ **الولایۃُ افضل من النبوۃ** (ولایت نبوت سے افضل ہے) کا حقیقی معنی یہی ہے یعنی پیغمبرانِ کرام کی ولایت اُن کی نبوت سے افضل ہے اُن کی ولایت کا تعلق باذاتِ ذوالجلال اور نبوت کا تعلق ان کی امت کے ساتھ منسلک ہے۔ اس ولایت کے خاتم الاولیاء کائنات کے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہؐ ہیں۔ جیسا کہ حضرت امام العارفین شیخ محی الدین ابن عربی المعروف بہ شیخ اکبر نے فرمایا ہے۔ مزید تشریح یوں ہے:

> ''نبی و مرسل بیک وقت ولی، صدیق، شہید اور صالح کتاب اللہ میں مذکور ہیں۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کو صراحتاً قرآن نے یوسفِ صدیق کے نام سے یاد کیا ہے۔ انبیاء کرام خاص کر بنی اسرائیل میں انبیاء شہداء کی فہرست از روئے تاریخ طویل ہے۔ اور بقول حضرت امام المحدثین مفسرِ بے بدل شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ جیسا کہ انہوں نے سرّ الشہادتین میں بہ تفصیل قلمبند فرمایا ہے کہ شہادت حسنین کریمین علیہم السلام دراصل شہادت امام الانبیاءؑ ہے۔ اور صالحین میں اوّل درجہ پر پیغمبران کرام ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ

نے حضرت ابراہیمؑ کی شان میں فرمایا: **انہٗ فی الاخرۃ لمن الصالحین** اور حضرت یوسف علیہ السلام نے **والحقنی بالصالحین** کی جو دعا فرمائی وہاں صالحین سے مراد انبیاءؑ کرام ہیں۔ اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ بعض لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ (مذکورہ سورۂ کہف) کے ضمن میں حضرت خضر علیہ السلام کو ولی قرار دے کر حضرت موسیٰ یعنی پیغمبر سے افضل گردانتے ہیں وہ عقیدۂ باطل ہے۔ مفسرین قرآن کریم نے اس عقیدہ کو رد فرمایا ہے اور ہمارے اسلاف کرام میں حضرت شیخ الاسلام علامہ بابا داوٗد خاکیؒ نے قصیدہ وردالمریدین در مدحِ حضرت سلطانِ دین محبوب العالم شیخ حمزہ مخدوم کشمیریؒ میں حضرت خضرؑ کو پیغمبر قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

باز اخضر گلشنِ ارشاد و رُشدِ شیخ ما
ہم زسقائی لطفِ خضر پیغمبر شدہ است"

حاصلِ کلام یہ ہے کہ:
ایک پیغمبر بیک وقت پیغمبر، صدیق، شہید اور صالح۔ البتہ ہر ایک صدیق کا پیغمبر ہونا ضروری نہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبر سیدنا ابوبکر الصدیقؓ جو افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں۔ ہاں ایک صدیق شہید بھی

اور صالح بھی مثلاً حضرت عمر فاروق، حضرت سیدنا امیر حمزہ، حضرت عثمان بن عفان اور حضرت علی مرتضیٰ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم ہیں۔ اور ایک شہید بیک وقت صدیق بھی، شہید اور صالح بھی جیسے حضرت سیدنا امیر حمزہؓ جو شہید ہی نہیں بلکہ سید الشہداء بخطاب حضرت سید الانبیاءؐ ہیں۔

اور ایک صالح بیک وقت صدیق بھی شہید اور صالح بلکہ شاہِ ولایت جیسے حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اس لحاظ سے اب ولایت کے چار مراتب ہیں۔

(۱) ولایتِ انبیاء (۲) ولایتِ صدیقین (۳) ولایتِ شہداء (۴) ولایت صلحا (صالحین)۔ البتہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے مرتبۂ نبوت ولایت تک کسی کی رسائی ناممکن ہے۔ آپؐ خاتم الانبیاءؐ والمرسلین اور ولایتِ نبوت (یعنی انبیاء) کے خاتم الاولیاء ہیں۔ اس کے بعد اہل بیت رسول اللہؐ، ازواج مطہرات، صحابۂ کرام وصحابیات کی ولایت کا درجہ ہے۔ تابعین میں سر خیل اولیاء کرام جن پر چاردہ سلاسل اولیاء کرام کا شجرۂ منتہی ہوتا ہے وہ حضرت سیدنا امام حسن بصریؒ کی ذاتِ گرامی قدر ہے۔ لیکن تاجِ ولایت کبریٰ اور سروری و سرداری کا طرۂ امتیاز حضرت سلطان الاولیاء شیخ السید عبد القادر جیلانیؒ کے سر ہے ۔

غوثِ اعظم درمیانِ اولیاء
چون جنابِ مصطفیٰؐ در انبیاء

چنانچہ آپ نے روز میثاق ولایت اعلانِ قدمی ہٰذہٖ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ اس کا برملا اظہار فرمایا۔ اسی لیے صاحب بہجۃ الاسرار یعنی آپ کے معتبر سوانح نگار شیخ الازہر حضرت امام ابوالحسن علی شافعی شطنوفیؒ نے آپ کی سوانح حیات کی ابتداء اسی اعلان ولایتِ کبریٰ سے فرمایا اور یہ وہ کتاب ہے جس کے متعلق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمۃ (جن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ اسلام کی پانچ سوسالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے) نے فرمایا ووثقہ المحدثون یعنی محدثین کرام نے اس کتاب کی توثیق کی ہے۔ ملاحظہ ہو فیض الباری شرح صحیح البخاری مطبوعہ مصر جلد دوم۔ بایں ہمہ حضرت غوثِ پاکؒ نے فرمایا جیسا کہ حضرت امام شیخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ فرماتے ہیں ؎

جُز نبوت ضبط کردم ہر مقام
تا بہ وحدانیت حق و السلام

اور یہ درجہ ولایت دو اقسام پر مشتمل ہے۔

(۱) ولایتِ وہبی (جو کوئی مادرزاد ولی ہوتا ہے) (۲) ولایت کسبی (جو بعد عبادت ومحنت شاقہ کا ثمرہ ہوتا ہے)، البتہ نبوت کسبی نہیں بلکہ وہبی ہے۔ سوائے حضرت ہارونؑ کی نبوت کے کہ وہ دعاءِ موسیٰؑ کی اجابت کا نتیجہ تھا واشرکہٗ فی امری (القرآن)۔ اور اب کوئی پیغمبر نہیں آسکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کا جو عقیدہ مسلمہ اہل امت میں ہے وہ صرف اس حد

تک کہ وہ بحیثیت مجدد مبعوث ہوں گے۔ یعنی بحیثیت امتی محمد رسول اللہؐ بلکہ بقول حضرت قیوم العالم امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ وہ بر مسلک حضرت امام اعظمؒ ہوں گے اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کی اشاعت کریں گے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے نہایت دلنشین انداز میں اس کی وضاحت یوں کی ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انبیاء برگزیدہ گانِ حق اند | بردہ از کل ما خلق سبق اند
ہست بر مقتضایِ فضلِ ازل | بعض از بعض افضل و اکمل
وز ہمہ افضل احمد عربیست | کہ زحق سوی ما رسول و نبی است
آن فضاہل کہ انبیاء را بود | و آن شمایل کہ اصفیاء را بود
گر شود جملہ مجتمع با ہم | ہمہ باشد بہ فضل احمد کم
ہر نبی راکہ حجتے دادند | جانبِ امّتے فرستادند
نیست مبعوث پیش شرع شناس | غیر احمد کسے بہ کافۂ ناس
خاتم الانبیاء والرسل است | دیگران ہمہ جزو او چو کل است
از پی او رسول دیگر نیست | بعدِ او ہیچ کس پیمبر نیست
چون در آخر زمان بہ قولِ رسول | کند از آسمان مسیح نزول
پیروِ دین و شرع او باشد | تابع اصل و فرع او باشد

اور یہ وہ مُلا جامی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

کشتۂ انداز ِ مُلا جامیم
نظم و نثرِ او علاجِ خامیم

الغرض اہلِ انعام کے آخری گروہ صالحین میں ایک مخصوص گروہ وہ ہے جس کو قرآن شریف میں اولیاء اللہ کے نام سے پکارا گیا ہے اور تخصیص کی گئی اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں بیان فرماتا ہے:

اَلا ان اولیاء اللّٰہ لا خوفٌ علیہم ولا ہم یحزنون○ الذین آمنوا و کانوا یتقون○ لہم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الآخرۃ لا تبدیل لکلمات اللہ ذالک ہو الفوز العظیم

(سورۂ یونس، پارہ نمبر۱۱)

ترجمہ: یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کے دوست ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا ان کی دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی منجانب اللہ تعالیٰ حزن وخوف سے بچنے کی خوشخبری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی باتوں میں یعنی وعدوں میں کچھ فرق نہیں۔ یہی ان کے لیے بڑی کامیابی ہے۔

اور یہ اہل ولایتِ کبریٰ کا وہ مخصوص گروہ ہے جن کے متعلق حضرت سید المرسلین خاتم الانبیاء محمد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ نہ انبیاء ہوں گے نہ

صدیق، نہ شہداء البتہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء ان کا مرتبہ دیکھ کر رشک کریں گے۔ یہ کوئی خوش عقیدگی نہیں ہے بلکہ اس کی تائید میں چھ[۶] احادیث ہم نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ لیکن احادیث نقل کرنے سے پہلے مرتبۂ احسان کے متعلق حدیث جبرئیلؑ نقل کرنا ضروری ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت پیغمبر اسلامؐ لوگوں میں تشریف رکھتے تھے کہ اچانک آپ کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر اور آخرت میں اللہ سے ملنے پر اور اللہ کے رسولوں پر اور دوبارہ زندہ ہونے پر یقین رکھو۔ اُس نے پوچھا اسلام کسے کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ خالص اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو جو نصاب فرض ہے اور رمضان کے روزے رکھو اور بصورت استطاعت حج فرض ہے۔ پھر اُس نے پوچھا کہ احسان کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو جیسے کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہ دیکھ رہے ہو تو یہ سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا یہ جبرئیلؑ تھے جو لوگوں کو ان کا دین سکھلانے آئے تھے۔ (بخاری شریف)

مرتبہ احسان پر فائز محسنین ''اولیاء اللہ'' کی شان میں شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے:

(۱) حضرت فاروق اعظمؓ سے روایت ہے کہ حضور پُرنورؐ نے فرمایا:

بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شہداء، قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام اور شہداء انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مقام دیکھ کر اُن پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمیں ان کے بارے میں بتائیں کہ وہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا ایسے لوگ ہیں جن کی باہمی محبت صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر ہوتی ہے نہ کہ رشتہ داری اور مالی لین دین کی وجہ سے۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ان کے چہرے نور سے مزین ہوں گے اور وہ نور کے ٹیلوں پر ہوں گے انہیں کوئی خوف نہیں ہوگا جب لوگ خوف زدہ ہوں گے انہیں کوئی غم نہیں ہوگا، جب لوگ غم زدہ ہوں گے۔ پھر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی: الا ان اولیاء اللہ لا خوف ولا ہم یحزنون۔ (ابوداؤد، نسائی)

نوٹ: مشہور سلفی عالم مفسر قرآن مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم نے اولیاء کرام کی توصیف والی آیت مرقومہ میں یہ حدیث مبارکہ درج کی ہے۔

(۲) حضرت سیدتنا ام المومنین عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس نے میرے کسی ولی کی توہین کی تو اُس نے میرے ساتھ جنگ کو حلال جانا اور کسی بندے کو میرا قرب جس قدر فرائض کی ادائیگی سے ہوتا ہے، کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔ میرا بندہ ہمیشہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ پھر اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں۔

اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں اور میں کبھی بھی کسی چیز میں اتنا تردد نہیں کرتا جسے میں کرنے والا ہوتا ہوں۔ جتنا تردد میں اپنے اس بندے کی روح قبض کرنے میں کرتا ہوں کیونکہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی تکلیف پسند نہیں کرتا۔

(رواہ امام احمد بن حنبل، ابو نعیم، طبرانی، بیہقی)

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو حضرت جبرئیلؑ کو آواز دیتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں۔ تم بھی اسے محبت کرو پس جبرئیلؑ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ پھر حضرت جبرئیلؑ آسمان مخلوق میں ندا دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلان بندے سے محبت کرتا ہے لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو۔ پس آسمان والے بھی اسے محبت کرنے لگتے ہیں پھر زمین والوں (کے دلوں) میں اس کی مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔

(۴) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو میرے کسی ولی سے دشمنی رکھے میں اُس سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں اور میرا بندہ الٰہی کسی چیز کے ذریعے میرا قرب نہیں پاتا جو مجھے فرائض سے زیادہ محبوب ہو اور میرا بندہ مسلسل نفلی عبادات کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان (کی سماعت) بن جاتا

ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ (کا نور) بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ (کی گرفت) بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں (کی توانائی) بن جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے تو میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں۔ اگر وہ میری پناہ مانگتا ہے تو میں ضرور اسے پناہ دیتا ہوں۔ میں نے جو کام کرنا ہوتا ہے اس میں کبھی اسی طرح متردد نہیں ہوتا۔ جیسے بندۂ مومن کی جان لینے میں ہوتا ہوں (ایسے میں کہ) اسے موت پسند نہیں اور مجھے اس کی تکلیف پسند نہیں۔

(رواہ البخاری، ابنِ حبان)

(۵) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے پھر آپؐ نے یہ آیتِ مبارکہ تلاوت فرمائی: ان فی ذالک لاٰیات للمتوسلین ۔ بے شک اس میں اہل فراست کے لیے نشانیاں ہیں۔ (مسندِ امام اعظمؒ، رواہ ابوحنیفہؒ) اور اِن اولیاء کرام کے بلحاظِ مراتب کئی اقسام ہیں اور اس سلسلہ میں چھٹی مستند حدیث مبارک یوں نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

(۶) حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء نے فرمایا میری امت میں چالیس ابدال ہمیشہ رہیں گے جن کے دل قلب ابراہیمی کے مانند ہوں۔ اُن کے صدقے اللہ تعالیٰ اہل زمین سے عذاب ٹالے گا انہیں ابدال کہا جائے گا۔ پھر آپؐ نے فرمایا انہوں نے یہ

رتبۂ ابدالیت کثرتِ صوم وصلاۃ کے ذریعے نہیں پایا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ؐ پھر کس چیز کے ذریعے انہوں نے یہ رتبہ پایا؟ آپ ؐ نے فرمایا سخاوت اور مسلمانوں کے لیے خیر خواہی کے ذریعے۔

(امام طبرانی وابونعیم وغیرہ)

ایامِ اختلافات با اہلِ شام جب اہلِ کوفہ نے حضرت شاہ ولایت ؓ سے درخواست کی کہ اہل شام پر لعنت کی جائے تو آپ نے خود شام میں چالیس ابدال والی حدیث نبوی ؐ کی تاکید کر کے اس کی ممانعت کی۔

اس مقام پر دو باتوں کا خاص خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱) اولیاء کرام میں اکثر کبارِ اصحاب مقام مقام صدیقیت (مرتبۂ حضرت صدیق اکبر ؓ) کا کچھ حصہ حاصل کرتے ہیں۔ اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے بارے میں آنحضرت ؐ نے صحابہ سے مخاطب کر کے فرمایا: ما فضلکم ابی بکرٍ بکثرت الصلوٰۃ والصیام ولکن شئیءٍ وُقِر فِی صدرہٖ۔ یعنی حضرت ابوبکر ؓ کی فضیلت آپ پر اس سے نہیں کہ وہ کثرتِ نماز وروزہ کے عامل ہیں بلکہ ایک چیز ہے جس نے ان کے قلب مبارک میں جگہ لی ہے۔ اربابِ حدیث اور صوفیاء کرام نے اتفاق کیا ہے کہ وہ چیز عشقِ نبوی ؐ تھا۔

(۲) اقطاب میں سے ایک جماعت جو قطب الاقطاب کے منصبِ عالی پر فائز ہوتے ہیں کو آخر سرزمینِ شام کی طرف ہجرت لازمی ہے۔ سابقین

میں سے حضرت شیخ محی الدین اکبرؒ، حضرت علامہ فخر الدین عراقی اور متاخرین میں جامع الکمالات حضرت ایشان شیخ یعقوب صرفیؒ کے مرشد حضرت شیخ کمال الدین حسین خوارزمیؒ وغیرہم نے اس مقام شہر شام کی جانب ہجرت کی اور وہیں مدفون ہیں۔

اولیاء کرام کے اقسام بلحاظ مراتب اور بلحاظ مرتبہ ایک دوسرے پر فضیلت جیسے صاحب کتاب کنز العمال حضرت امام الحدیث علامہ شیخ علی متقی قادری شاذلی برہان پوری ثم مکی نے ایک دوسری تصنیف جوامع الکلم میں تلک الرسل فضلنا بعضھم علیٰ بعضٍ کی آیت کے تناظر وکذالک کے الفاظ میں بہ متابعتِ مرسلین اولیاء کرام کے مراتب وفضائل پر بحث کی ہے۔

ان اہل ولایت کی اقسام کی تفصیل مندرجہ ذیل کتب اولیاء سابقین ومتاخرین میں یہ تفصیل ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

(۱) رسالہ قشیریہ از حضرت امام ابوالقاسم قشیریؒ (۲) قوت القلوب از حضرت ابوطالب مکیؒ (۳) حلیۃ الاولیاء حضرت ابونعیم اصفہانیؒ (۴) کشف المحجوب از حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (۵) غنیۃ الطالبین وفتوح الغیب از حضرت غوث الاعظم شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ (۶) جملہ تصانیف پیرِ ہرات خواجہ عبداللہ انصاریؒ (۷) عوارف المعارف از حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (۸) فتوحات مکیہ وفصوص الحکم از حضرت امام العارفین شیخ محی الدین ابن عربیؒ (۹) ملفوظات خواجگانِ چشت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین (۱۰) فصل الخطاب تصنیف حضرت سیدنا خواجہ محمد پارساؒ (۱۱) نفحات

الانس از حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامی (۲۱) رسائل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۳۱) تصانیف حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۴) مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ اور اہل کشمیر اپنے سابقین و متاخرین کی مندرجہ ذیل کتابوں کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔

(۱) تصانیف حضرت شاہ ہمدانؒ (۲) تصانیف حضرت جامع الکمالات جناب ایشان شیخ یعقوب صرفیؒ (۳) تصانیف حضرت شیخ الاسلام علامہ شیخ بابا داؤد خاکیؒ (۴) بحر العرفان از حضرت شیخ اکمل الدین مرزا محمد کامل بیگ خان بدخشیؒ (۵) تصانیف حضرت خواجہ محمد اعظمؒ دیدمری وغیرہ۔ یہ سب اہل ولایت محسنین انسانیت' دردمند قلوب کے حامل' خدمتِ خلق کا بہترین اصحابِ شغل تھے۔ حضرت سلطان الاولیاء شیخ سید عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک دفعہ نفلی اعتکاف (اربعین) کی شروعات کی۔ چند ایام گذرنے کے بعد ایک صاحبِ حاجت حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے اس کی خاطر اعتکاف فسخ کیا۔ لہٰذا جن کرامات کا ان سے ظہور ہوا، اعلاءِ کلمۃ الحق کے ساتھ ساتھ اُن میں بنی نوع انسان کی تالیفِ قلب جذبہ کارفرما تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی اولیاء کرام کی تعلیمات کی معنویت عصری ضرورت ہے۔ کیونکہ آج ساری دنیا نفرت، بغض، حسد، عداوت، رشک، بالادستی اور کینہ کی آگ میں جل رہی ہے۔ ہر جگہ فساد اور نقضِ امن بپا ہے۔ ہر مذہب چہ جائیکہ دینِ اسلام کی حقیقی تعلیمات سے بغاوت کا دور دورہ ہے۔ اور پھر یہ سب کچھ مذہب کے نام پر جاری و ساری ہے۔ عصری علوم

نے آسمانوں میں کمند لگائی مگر زمین میں اخلاقیات کا جنازہ نکل چکا ہے۔

آج پھر ایک دفعہ روحِ عبادت، خدمتِ خلق، توبہ واستقامت، صدق واخلاص، اطعام وتوکل، اِنفاق، عقل وعشق، کثرت کے فلسفہ کی اہمیت کے احیاءِ نو کی ضرورت ہے۔ مادیت اور مادہ پرستی نے انسانی اقدار کا خاتمہ کیا ہے۔ حالانکہ دینِ اسلام نے کبھی بھی ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی تھی اور پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: لا رہبانیۃ فی الاسلام۔

ہماری ریاست کے سرکردہ ولیِ کامل حضرتِ شیخ العالم شیخ نورالدین نورانیؒ نے بے شک ترکِ دنیا کر کے چند بہترین ایام جنگلوں میں بسر کیے مگر حضرت شہباز لامکانی میر سید محمد ہمدانیؒ کی بیعت کر کے اس عمل سے رجوع فرمایا اور حضرت بابا نصرالدینؒ (خلیفہ چہارم) سے فرمایا ؎

نصر بابہِ جنگل کھسن گیم خامی | مے دؤپ یہِ آسہِ بڈ عبادت
وچھتہِ یہَے اَس بڈ بدنامی | سرِ اَس کرِنی کُنی کتھ

آیئے اس تمہیدِ طولانی کے بعد پیش نظر کتاب ''حیاتِ رحیم'' یعنی سوانح حیات جناب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قلندر صفاپوری کشمیری پر ایک مختصر علمی وتحقیقی جائزہ قلمبند کر کے شاعرِ کشمیر جناب پیرزادہ غلام احمد مہجور کے اس عظیم کارنامہ پر اہل کشمیر و پرستارانِ مہجور کو ''روحانیت'' جس کی تلاش میں اب یورپ سرگردان ہے کی جانب دعوتِ فکر دیں۔ مہجور کو اہل ریاست و بیرونِ ریاست صرف اور صرف نابغۂ روزگار عبقری شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

لیکن حیاتِ رحیم میں جھانک کر اُس کے ایک اور ہی روحانی چہرے کا مشاہدہ ہو رہا ہے اور حیاتِ رحیم آپ کے ماورائے شاعری کے عقائد کا زندہ جاوید ترجمان ہے۔ یوں تو آپ نے ہمیشہ اپنے پیش رو شخصیات کی عظمت کا خاص خیال رکھا۔ جیسے شاعرِ بے بدل رسول میر شاہ آبادی کی شخصیت اُن کی شاعری اور اسے اپنے اکتسابِ فیضان کا ذکر یوں کیا ہے۔

اَتھ دردِ صوٗزٕ ژ پرٕ تُلِتھ گوٗ وسہ روٗسُل میر
مہجوٗر لاٗگِتھ آو بیٚہ دُبارٕ اٚتی روز

ایضاً

میر سُند پژون مَس بوٗرنوٗبن بانَن
تِہ کُنن تژوو موے خانَن منز
مہجوٗر باٗگراو پھِر ژٕ پے مانَن
جاے تمی رٕٹ پٕرستانَن منز

یا معاصر شعراء میں میر شمس الدین حیرت کاملی پاندانی اور ماسٹر زندہ کول کی قابلیت کا اعتراف اس شعر میں کیا ہے

میٲنہٕ کتھہٕ ورگس کھسن لگہٕ رنگ میٲنبن آلوَن
حاٗرتس غاٗرتھ بِین بیٚہ زٔندٕ روٗزن زٔندٕ کول

آپ نے حیاتِ رحیم لکھ کر نہ صرف ہماری تاریخ رفتہ کا حرف آخر تحریر فرمایا۔ بلکہ اُس حسین داستان سے ہم کو آگاہ کر دیا ہے اور ہم کو روحانی میراث کی جانب توجہ دلائی۔ ۱۲۸ر صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ایک اور ہی قدامت پسند مہجور نظر آرہا ہے جو جدیدیت کا باغی ہے۔ قدامت پسند اس لحاظ سے کہ وہ خود بقیۃ السلف و حجۃ الخلف ہے۔ سلفِ صالحین کشمیر سے جو کچھ حاصل کیا ہے۔ وہ بطور سوغات (داشت بکار آید) آئندہ نسل کے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔ آپ نے یہ کتاب ۱۳۳۸ھ کے موسمِ بہار میں لکھی۔ لیکن دو سال تک مسودہ تشنۂ طباعت رہا۔ یہ تھی زمانہ کی قدردانی۔

مہجوؔر رسُلہِ کو وو آکھ، زرا ژیری پی زِ ہے یور
دیو ژیتہِ پہنے کو نگہِ پوشِکو پاٹھو خریدار

مگر اس سے بڑھ کر سانحہ یہ ہے کہ گذشتہ چند دہائیوں سے آپ کے نام پر جو کچھ کیا گیا اُس طرزِ عمل کے پیش نظر کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے تک کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور یہ فیصلہ اب ہم تاریخ کے سپرد کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔

انتساب جہاں اپنے والد نسبتی حضرت پیر غیاث الدین شاہ صاحب متوطن موضع یارِ کلان جو آپ کے پیرِ صحبت اور حضرت رحیم صاحب صفاپوری کے خلیفہ برحق تھے کی جانب کیا گیا ہے۔ وہاں دیباچہ میں کشمیر کی دو عظیم شخصیات کا ذکرِ خیر کیا گیا ہے:

(۱) جناب خواجہ غلام احمد عشائی یکے از بانیانِ تحریک حریت کشمیر اور سابق رجسٹرار کشمیر یونیورسٹی، جو خود مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل تھے اور علم و ادب کے معاملہ میں بہت کم کسی کو درخورِ اعتنا لاتے تھے اور ایک تاریخ ساز علمی شخصیت جس کے سامنے جیل میں زانوئے ادب تہہ کر کے جناب شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے تقریباً دس سال مثنوی مولانا رومؒ کا درس لیا۔

(اکتسابِ فیضان مثنوی کا یہ واقعہ استاذی المکرّم جناب حضرت علامہ سید محمد اشرف صاحب اندرابی مرحوم و مغفور نے عشائی صاحب سے سماعت کیا تھا)

(۲) جناب مورخ کشمیر محمد الدین فوق۔ اُس محسنِ ملت کی تعریف کے لیے یہ کافی ہے کہ حکیم الامت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے اُنہیں ''مجددِ کشامرہ'' کا خطاب دیا تھا۔

اور جس نے ہزاروں صفحات پر مشتمل کتبِ قیمہ میں مختلف عنوانات و موضوعات کے تحت اگر ہماری تاریخ قلمبند کرنے کا فریضہ انجام نہ دیا ہوتا تو خاکسار کے خیال میں ہماری تاریخ کا سنہری شاندار حصہ تلف ہوتا۔ ساتھ ہی جناب پیر نور الدین شاہ صاحب کا اظہار تشکر کیا ہے جنہوں نے اپنی ذاتی لاگت پر کتاب شائع کی۔ اور جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے کتاب کی صحت و ترتیب، نظر ثانی اور اہتمام طباعت و کتابت کا کٹھن مرحلہ طے کرنے میں تعاون دیا۔

بعدہٗ چوبیس صفحات پر ایک علمی تمہید میں بلا خوف لومۃ لائم کشمیر کی علمی تاریخ کو یوں دہرایا ہے۔ اور برملا تحریر فرمایا: ''کشمیر کو اس سے فضیلت نہیں ہے کہ یہ خطّہ سرسبزی وشادابی وغیرہ کی بدولت جنت نظیر خطہ ہے بلکہ دنیا کے بہت سے مقامات کو یہ طرہ امتیاز حاصل ہے۔ اصلی فضیلت کا راز علم وفضل وروحانیت ہے۔ جو اس خطہ مینونظیر میں صدیوں کی میراث ہے۔ جس کی بدولت ایرانِ کبیر کے فلاسفر شاعر اور ادیب اس ایرانِ صغیر میں رطب اللسان رہتے تھے۔''

پھر آگے آپ نے فخر ومباہات کے ساتھ تحریر فرمایا ہے:

''اسلامی تہذیب نے اس نورانی کشش و طاقت کو چار چاند لگا دیئے تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس وادی نے وہ انسان دنیا کے آگے پیش کئے جن کی نظیر پیر گردوں آج تک کہیں نہ دکھاسکا''۔

(حیاتِ رحیم)

اس دعویٰ کی دلیل میں ایک تقابلی امثال میں تاریخ کشمیر کے گہرے مطالعہ کا ثبوت پیش کیا ہے جس کو راقم الحروف قارئین کرام کی سہولت کے لیے ایک تقابلی خاکہ میں پیش کر رہا ہے ملاحظہ ہو۔

ایرانِ کبیر	ایرانِ صغیر (کشمیر)
۱۔ حضرت حافظ شیرازی	۱۔ ملا طاہر غنی کشمیری (جن کی ملاقات کے لیے صائب ایرانی نے کشمیر کا سفر اختیار کیا)

۲۔ فردوسی طوسی ۲۔ شیخ عبدالوہاب شائق

۳۔ نظامی گنجوی ۳۔ حضرت صرفیؒ۔ ملا بہاؤ الدین متو، ملا اشرف دیری، ملاحمید

۴۔ مولانا جلال الدین رومیؒ ۴۔ حضرت شیخ اکمل الدین مرزا محمد کامل الدین خان بدخشی

۵۔ ابنِ بطوطا (سیاحِ عالم) ۵۔ حضرت ایشان شیخ یعقوب صرفیؒ

۶۔ امام فخرالدین رازی ۶۔ حضرت جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفیؒ

اور علماءِ برگزیدہ میں حضرت شیخ بابا داؤد خاکیؒ، علامہ کمال الدین کاشمیری (استاذِ عبدالحکیم سیالکوٹی وحضرت مجددِ الف ثانیؒ ونواب سعدالدین خان علامی وزیرِ شاہِ جہان) صدرالصدور مولانا صدرالدین آزردہ (استاذِ سرسیداحمد خان) وغیرہ کا ذکرِ خیر کیا ہے۔

اولیاء خاک پاکِ کشمیر میں حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین نورانیؒ و حضرت محبوب العالم شیخ حمزہ مخدومؒ کو امام مشارق ومغارب کے طور یاد کیا۔ کشمیر کے ہر محلّہ، گاؤں، قصبہ میں آرام فرما بزرگانِ دین میں ہر ایک کو حضرت جنید بغدادیؒ وحضرت بایزید بسطامیؒ کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ سرزمین کشمیر کی جانب ہجرتِ امیرؒ، ہجرتِ ساداتِ ذوالاحترام اور دورِ بڈشاہی (سلطان زین العابدین) میں اہل علم وفنون وصنعت وحرفت کی دائمی اقامت اور پھر ان کے کارناموں کو یاد کیا ہے۔

پُرکمال وعروج ادوار کا تذکرہ کرکے پھر ادوارِ زوال وپستی کا منثور

مرثیہ لکھا ہے۔ اپنے ماضی قریب کے دور کو قحط الرجال کا دور اور زمانہ فرار کا نام دے کر کشمیر کے ایک گمنام گاؤں کے ولی کامل سلطان الفقراء تاج الاولیاء جناب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قلندر صفاپوری کشمیریؒ کو مغتنم الوجود قابلِ صد افتخار شخصیت مان کر اُن کی سوانح کی شروعات کی ہے۔

مہجورؔ نے منشی محمد الدین فوقؔ کو فدائے قوم کا لقب دے کر اُن کے کارناموں کو سراہا ہے جن کی بدولت اُس زمانہ میں اہل کشمیر اپنا سر اونچا رکھنے کے قابل ہوئے۔

اور پھر اپنی دیرینہ آرزو کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ اپنے اسلافِ کرام (یعنی کشمیر کے اکابرینِ علم و فضل و روحانیت) میں ہر ایک پر کتاب لکھنے کے آرزومند تھے۔ اور پھر اہل کشمیر کے اُس 'بُخل' کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اسلاف کرام کی کتابیں طاق نسیان کے حوالہ کر کے اُن کو غذائے کرمان بنا دیا۔

اور آگے زبردست اور حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ اہل کشمیر کو یہ مرض صدیوں سے لاحق ہے۔ اور بطورِ سند حضرت جامع الکمالات صوری و معنوی شیخ یعقوب صرفیؒ کی تصنیف مسلک الاخیار میں درج اشعار کو نقل کر کے ہزاروں کتب خانوں کی بربادی کی خبر دی ہے۔

حضرت رحیم صاحب کو قلندر کے لقب سے ملقب کر کے لفظِ قلندر کی توصیف حضرت غوث الاعظمؒ کے ایک شعر علاوہ حضرت بوعلی شاہ قلندر پانی پتیؒ کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت بوعلی شاہ کو نزیل دہلی لکھ کر یا تو پانی پت کے علاقہ کو، دہلی کا حصہ قرار دیا ہے یا اُن کے دورۂ دہلی جس میں انہوں نے

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی بیعت کی ہے کی جانب اشارہ کیا ہے واللہ اعلم۔

مگر ذہن اس طرف نہیں گیا ہے کہ ہر سلسلہ طریقت میں سلسلہ قلندریہ بھی موجود ہوتا ہے۔ حضرت شیخ احمد جامؒ (شیخ الاسلام زندہ بیل) کی دیوان میں قلندر نامہ موجود ہے اور حضرت مہجور کے ہم عصر حضرت پیر عزیز اللہ حقانیؒ نے اپنے متعلق لکھا ہے ۔

نقشبندی تہ چشتیک اِرشاد
چھم براہِ قلندری لولو

اور حضرت رحیم صاحب صفاپوری کے قرب و جوار میں ہی لار کے مقام پر برگزیدہ ولی کامل حضرت سید شاہ صادق قلندرؒ کا مزارِ پرانور موجود ہے جو بنیادی طور نقشبندی تھے۔ انہوں نے دورِ قلندریت میں ہی دیوان تشکیل دیا ہے اور قلندر تخلص اختیار کیا ہے ۔

ما فقیران را قلندرؔ، احتیاج مال نیست
خاک مارا زر شود، از کیمیائے نقشبند

علامہ اقبالؔ نے کیا خوب فرمایا ہے ۔

قلندر جز دُو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہرِ قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

باقی رحیم صاحب کی ذات میں مہجور کا قلندرانہ اوضاع مشاہدہ نہ کرنا۔ میرے نزدیک حجت نہیں ہے۔ یہاں میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کے تناظر میں یہ بحث اختتام کرتا ہوں۔

تمہید کے بعد تین صفحات پر نالۂ مہجور (بطرزِ مثنوی مولانای رومؒ کے نام سے پچاس اشعار (بزبانِ فارسی) اپنے عشقِ حقیقی، درد وسوز، وحدت الوجود کا نظارۂ دلربا اور دیدارِ حقیقی کی تڑپ کو حوالہ قرطاس کر دیا ہے۔ اور اپنے چند مقامات کی خبر دی ہے۔ اس میں ''آورد'' نہیں بلکہ ''آمد'' ہے ورنہ آپ بھی اسرارِ خودی یا رموز بیخودی کے طرزِ مثنوی پر مثنوی لکھتے۔

استاذِی المکرّم جناب حضرت سید مبارک شاہ صاحبؒ گیلانی فطرتؔ کاشمیری (جو آپ کے معاصر تھے) نے ایک شعر میں آپ پر طنز کیا ہے کہ آپ نے حضرت احمد صاحب بٹواری کی غزل پر تتبع کر کے اُن کے خیالاتِ باطنی کا سرقہ کیا ہے۔

بٹوٲرؠ بچاٲرؠ کوٚر عشقہٕ سودا
مہجوٗرَن ژوٗرِ نیوٗس مال مدنو

ایسا بقولِ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ جیسا کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے۔ والمعاصرۃ اصل المنافرۃ ہم عصر ہونا ہی مصیبت و نفرت کا اصل الاصول ہوتا ہے۔ ورنہ چند سال قبل ابنِ فطرت میرے جلیل القدر دوست جناب سید اسلم فرحتؔ گیلانی نے ایک صحبت میں مہجورؔ کے چند

اشعار سنا کر مجھے محوِ حیرت کر دیا کہ ایسے انداز کے اشعار میں ''آورد'' کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

حضرت رحیم صاحب صفاپوری کی اصل سوانح ایک سو صفحات پر محیط ہے جس میں بغیر کسی تصنع کے تحقیق و تفتیش کا حق ادا کیا گیا ہے۔ موصوف کے آباء و اجداد و آبائی وطن کے ضمن میں تاریخ کے اوراق کھنگال کر لب لباب پیش کر دیا گیا۔

میں نے ابتداء میں تحریر کیا ہے کہ تصوف خدمتِ خلق کا دوسرا نام ہے۔ بقولِ مولانا رومؒ ؎

ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید او محروم شد

سال ۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۵ھ کے قحط کے متعلق جو لرزہ خیز عکاسی مہجور نے کی ہے۔ وہ ایسا قحط تھا جیسا کہ سعدی شیرازی نے قحطِ دمشق کی تصویر کشی اس شعر میں کی ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاران فراموش کردند عشق

اُس وقت حضرت شاہ عبدالرحیم صفاپوری کی عمر شریف ۳۹ سال کی تھی آپ نے اس قحط میں بنی نوع انسان کی جو خدمت کی ہے اس پر فخر کر کے مہجور نے اُن خدمات کا عنوان ''ہمدرد بنی نوع انسان کی بے نظیر مثال''

مقرر کیا ہے۔

حضرت فقیر رسول شاہ صاحب لاری اُور پش کے ساتھ تعلقات پر مفصل روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اُن کا لنگر خانہ کے لیے مہاراجہ رنبیر سنگھ کا وظیفہ کا واقعہ درج کر کے اُس پر فقیر رحیم صاحب کے احتجاج اور پھر وہاں (رسول صاحب کے فقیر خانہ) پر کبھی بھی جانے کی خواہش نہ کرنا۔ آج کل کے پیروں درویشوں اور اپنے کو اربابِ طریقت شمار کرنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔

حضرت علامہ خاکیؒ نے حضرت محبوب العالمؒ کے حالات میں لکھا ہے ؎

پیش آن سلطان دین است از گدا بے قدر تر
آنکہ در دنیا شہنشاہ چون جم و نودر شدہ است

اور حضرت شیخ سلیم چشتیؒ (فتح پور سیکری) آگرہ (مرشدِ حضرت ایشان شیخ یعقوب صرفی و حاجی الحرمین قطب الاقطاب شاہ قاسم حقانیؒ) کا کلام ہے ؎

شاہ ما را نان دہد منّتِ نہد
رازقِ ما رزق بے منّت دہد

قرآن شریف کا حکم ہے: ''سیروا فی الارض فانظروا کیف کان

عاقبۃ المکذبین۔'' اکثر اولیاء کرام نے سیاحت اختیار کی ہے حضرت مولانا نورالدین جعفر بدخشیؒ (خلیفۂ شاہِ ہمدانؒ) نے ان اولیاء کرام کو زمرۂ اخیار میں شمار کیا ہے۔ رحیم صاحب اگرچہ بیرون ملک تشریف نہیں لے گئے لیکن ''سفر در وطن'' کے تناظر میں کشمیر کے اہم مقامات کی سیاحت کی ہے۔

حضرت سلطان الفقراء رحیم صاحب کے بحیاتِ خویش مقبرہ کی تعمیر کا واقعہ پڑھ کر حضرت محقق علی الاطلاق جناب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مقبرہ کا واقعہ یاد آتا ہے کہ گورنر مہابت خان نے مقبرہ تعمیر کیا اور حضرت شیخ سے فرمایا مقبرہ تیار ہوگیا ہے۔ آپ نے جواباً فرمایا ہم بھی تیار ہیں اور اسی شب میں انتقال فرمایا۔

تعمیراتِ مقابر اولیاء کرام سنتِ انبیاء کرام ہے۔ حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ نے خود اپنے برادرِ بزرگ حضرت سیدنا عبدالرحمٰن بنِ حضرت امیر المومنین جناب صدیق اکبرؓ کا مقبرہ شریف تعمیر کیا تھا۔ اور حضرت امامِ ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی الفاروقیؒ نے حضرت شاہ محمد صادق (فرزندِ اوّل) کی قبر شریف پر گنبد بنانے کی ترغیب دی تھی۔ شامی شریف (شرحِ دُرِ مختار) میں حضرت علامہ ابن عابدین نے اس مسئلہ کو وضاحت کے ساتھ درج کیا ہے۔

مہجورؔ نے ''حضرت سلطان الفقراء کی پیدائش کا ملک پر اثر'' اور واقعہ وصال تحریر کرکے ''حضرت سلطان الفقراء کی وفات کا اثر دنیا پر'' پر جیسے عنواناتِ دلچسپ کے تحت جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ

کن عقائد کے حامل تھے۔

باب اخلاق و عادات کا لفظ لفظ بھی قابلِ مطالعہ و قابلِ تقلید ہے۔ اس سلسلہ میں بابِ سماع کا بھی ذکر آیا ہے۔ مشہور نقشبندی بزرگ میرے مرشدِ سلسلہ نقشبندیہ حضرت علامہ شاہ ابوالحسن زید مجددی فاروقی (فاضل جامع ازہر) سابق سجادہ نشین درگاہِ حضرت مرزا مظہرِ جانِ جاناں المعروف درگاہِ شاہ ابوالخیر دہلویؒ نے اس موضوع پر ایک انتہائی محققانہ رسالہ "غناء و سماعِ اصفیاء" رسالہ تحریر فرمایا جس کو شارحِ مثنوی مولانا روم علامہ قاضی سجاد حسین (شاگرد رشید علامہ انور شاہ کشمیری) مسئلہ سماع پر محققانہ تحریر سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت عارف باللہ خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر سماع حرام ہے تو مطلق حرام کے ذریعہ قرب الٰہی ناممکن ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ شاہ ابوالحسن زید نقشبندی بزرگ تھے وہاں موسیقی یا سماع کا گذر ناممکن تھا البتہ انہوں نے رسالہ لکھ کر ثابت کر دیا ہے۔ اسلام کسی خشک مذہب کا نام نہیں ہے

مہجور نے حضرت رحیم صاحب کی صرف گیارہ کرامات کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ خود تحریر فرمایا ہے کہ کشف و کرامات کی تعداد سینکڑوں میں خصوصاً جن کی سماعت آپ نے حضرت پیر غیاث الدین صاحبؒ سے کی تھی۔

کرامات مافوق العقل اشیاء کا دوسرا نام ہے۔ اور شریعت مطہرہ نے معجزات کو انبیاء کا خاصہ اور کرامات کو مافوق العقل کمالاتِ اولیاء سے تعبیر کیا ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابنِ تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت غوث الاعظمؒ کی

کرامات بحدِ تواتر ثابت ہیں۔ (ملاحظہ ہو تاریخ دعوت وعزیمت از حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی مرحومؒ)۔

اور حضرت شیخ العلامہ ابوالحسن سراج الدین علی بن عثمان الاوشیؒ نے قصیدہ بدءالامالی میں لکھا ہے ۔

کرامات الولی بدارِ دُنیا
لہا کونُ فُہم اہلُ النوال

اس قصیدہ کی شرح حضرت امام ملا علی قاری نے لکھی ہے۔

باقی کرامات دیکھ کر یا پڑھ کر تسلیم کرنا یا منکر ہونا یہ قدیم دستورِ زمانہ ہے۔ حضرت علامہ خاکیؒ نے وردالمریدین میں مرشدِ برحق کی کرامات کا ذکر کر کے آخر پر ایک عمدہ شعر تحریر فرمایا ہے جو اصل الحقائق ہے ۔

منکر ار باور ندارد این کرامت دور نیست
کے بہ بوجہلِ سیہ دل معجزہ باور شد است

رحیم صاحب کے چند اقوال زرّیں، پیر غیاث الدین صاحب کا حلقۂ ارادت میں آنا، رئیس زادہ امرتسر سردار دریام سنگھ کا قبولِ اسلام کا واقع جوان دنوں تحصیلدار کشمیر ویلی تھا بھی سبق آموز اسباقِ طریقت ہیں۔

کتاب کا اختتام اپنے اس شعر پر کیا ہے ۔

مظہر شانِ رحیمی المدد
قاسمِ خوانِ کریمی المدد

استمداد کے متعلق علماء امت کا مسئلہ واضح ہے کہ حقیقی طور صرف اور صرف دربارِ الٰہی کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ مجازی طور غیر اللہ سے مدد مانگ سکتے ہیں۔ حضرت سید الطائفہ امام العلماء مولانا محمود الحسن دیوبندی (استاذِ علامہ انور شاہ محدثِ کشمیری) نے تفسیر قرآن میں ایاک نعبد وایاک نستعین میں یہ مسئلہ واضح کر دیا ہے۔ یہ تفسیر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سابق شیخ الاسلام سلطنتِ پاکستان نے مکمل کی ہے اور سعودی گورنمنٹ نے حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی کی سفارش پر اس کی اشاعت کی۔

بہرکیف بانی دارالعلوم دیوبند حضرت امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بھی استمدادِ مجازی کے قائل تھے، آپ کا یہ نعتیہ شعر مشہور ہے۔

مدد کر اے کریم احمدی کہ تیرے سوا
نہیں ہے قاسمِ بے کس کا کوئی حامی کار

اور بانی تحریک اہل حدیث نواب سید صدیق حسن خان بھوپالیؒ کا یہ شعر مشہور ہے۔

زمرۂ رائے در افتادہ بہ اربابِ سُنن
شیخ سُنّت مددے قاضی شوکاں مددے

حضرت علامہ امام الفقہاء المحد ثین عبدالحی لکھنوی نے پڑھ کر یہ فقرہ چسپان کیا ہے۔

فمن الذی حرم الاستمداد بالغوث الصمدانی والرسول الربانی واحلل الاستمداد بالشوکانی

یہ وضاحت اس لیے ضروری تھی کہ کوئی مہجور (جو ہمارے قابلِ فخر مفکر وشاعر ہیں) پر کوئی خُردہ گیری نہ کرے۔

آخر پر میں لایق وفائق قابلِ تعظیم علمی شخصیت نبیرۂ شاعرِ کشمیر مہجور ابن ابنۂ جناب پیرزادہ ابدال مہجور کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یہ شرف بخشا کہ حیاتِ رحیم کا مقدمہ تحریر کر کے گلہائے عقیدت بدر بارِ مہجور نچھاور کروں۔ میں نے حضرت مہجور کے مریدِ خاص مرحوم ومغفور جناب غلام محی الدین جان صاحب (ملک شاہ صاحب، صفا کدل) سے آپ کے بے شمار واقعات سنے تھے۔ جان صاحب نے حضرت پیر غیاث الدین صاحب کو بھی دیکھا تھا اور اُن سے استفادہ کیا تھا۔

شاعرِ کشمیر مہجور کی یہ کتاب آج کل کے ادباء، شعراء، اہل علم وفضل کے لیے مشعل نور و مینارۂ نور ہے کیونکہ جدیدیت کی آڑ میں آباء واسلاف کرام کو فراموش کرنا یا اُن کے کارنامے بیان کرنے کو شرمندگی سے تعبیر کرنا ہمارا دستور بن گیا ہے۔ آپ نے کتاب کے آخر میں عرس مبارک رحیم صاحب اور اُن کا ختم شریف تحریر کر کے اپنے عقائد کی تحریری ترجمانی کی

ہے۔ حضرت شاہ محمد عاشق پھُلتی نے اس سلسلہ میں القول الجلی فی ذکر آثار الولی (ملفوظات حضرت شاہ ولی اللہ محدث) میں شاہ صاحب کا موقف وعمل قلمبند فرمایا ہے جو ہمارے لیے حجت ہے۔

اختتامِ کتاب پر جناب مہجور مرحوم نے حضرت شاہ عبدالرحیم صفاپوری کا ختم شریف نقل کیا ہے۔ کتاب پڑھ کر موجودہ دور کے ناقدین اس پر ضرور انگشت نمائی کریں گے۔ لہٰذا اوضاحتاً چند سطور ازالہٗ اوہام کے طور عرض ہیں۔ خالص تلاوت قرآن مجید کا ختم یعنی ختم قرآن کا معمول ساری امتِ مرحومہ کا معمول ہے چاہیے کسی بھی صورت (یعنی نماز، تراویح یا بیرون نماز) یہ عمل انجام دیا جائے۔ اور احادیث نبویؐ میں ختم قرآن کے بعد قبولیتِ دعا کی بشارت مرقوم و مذکور ہے۔ اسی طرح قرآن شریف کے بعد مجموعۂ احادیث یعنی صحیح البخاری (تالیف حضرت امام المحدثین سیدنا محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ) یعنی بخاری شریف کا ختم شریف (یعنی خالص تلاوتِ احادیث نبویؐ) پوری امت میں تواتراً معمول سلف وخلف ہے۔ چنانچہ علماء اہلحدیث نے صراحتاً حضرت امام بخاری کی سیرت اور شروحِ کتب علمیہ (بخاری شریف کے مختلف شروح) میں صراحتاً ختم بخاری کے فضائل و ثمرات پر روشنی ڈالی ہے کہ خالص قرآت بخاری شریف بطورِ ختم شریف مجرب ہے۔ میں یہاں فیض الباری اُردو ترجمہ فتح الباری (تصنیف حضرت امام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ) شرح صحیح البخاری جلد نمبر ۱، صفحہ ۱۱ کی یہ عبارت اس سلسلہ میں نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ (واضح رہے کہ فیض

الباری کے مؤلف علامہ محمد ابوالحسن سیالکوٹی مرحوم ہیں۔ جو ہندوستان کے علماء اہلحدیث کے شیخ الکل جناب مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے)۔

> ''شدت اور خوف، سختی و مرض اور قحط وغیرہ مصائب میں صحیح بخاری کا ختم تریاق مجرب ہے چنانچہ حرمین شریفین میں اب تک اس کا معمول مروج ہے''۔

حرمین شریفین میں ختم بخاری کے معمول کا تذکرہ جو اس مقام پر مرقوم ہے یہ تقریباً ایک صدی قبل کی بات ہے۔ آج حرمین شریفین میں یہ معمول نہیں ہے۔ لہٰذا مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ کے علماء مختلف مکاتبِ فکر کے ہاں ان کے گھروں میں اس کا معمول ہے۔ مکہ معظّمہ میں ہی حضرت سیدنا امام عباس مالکی علوی، حضرت امام سید علوی اور حضرت امام اہل سنت جناب سید محمد علوی مالکی علیہم الرحمۃ نے یہ سلسلہ جاری رکھا تھا۔ جامعۃ الازہر مصر (قاہرہ) میں ختم بخاری کی شہادت حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے دی ہے۔ ازہر الہند دارالعلوم دیوبند اور کشمیر میں خاندانِ میرواعظان کشمیر و مفتیانِ عظام وسجادہ نشین حضرات کے گھرانوں میں اس ختم کا دستور تھا۔

قرآن شریف اور بخاری شریف کے علاوہ ختم حصن حصین (تصنیف امام جزری) اور ختم دلائل الخیرات (تصنیف امام جزولیؒ مغربی) اور ختم شریف خواجگانِ نقشبندیہ بھی مروج ہے۔ حضرت امام اکبر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء'' میں مختلف سلاسل اولیاء کے

اکابرین کے معمولات کو بشکل ختم وختمات مرتب فرمایا ہے۔ جناب حضرت مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی نے اپنے مرشد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی سوانح میں ان کے خانقاء شریف ختم خواجگان کا ذکر کیا ہے۔علاوہ ازیں ختم خواجگان نقشبندیہ خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون یوپی میں بارشادِ حضرت مفسر قرآن حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور شیخ الاسلام پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب تفسیر معارف القرآن کی عصری مجالس میں بھی اس ختم کا دستور رائج تھا۔ راقم الحروف نے اپنی ضخیم تصنیف سیرۃ البخاری (سوانح حیات حضرت الاستاذ علامہ سید محمد قاسم شاہ صاحب بخاری) کے باب نمبر ۱۰ میں تفصیلاً اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ کشمیر میں دعاءِ یونس لا الٰہ الا اللہ انت سبحانک انی کنت من الظالمین کے پڑھنے کا جو اہتمام صلوٰۃ مکتوبہ کے بعد ہے اس کی فضیلت کا راز تفسیر دعاء یونسؑ از علامہ ابن تیمیہؒ (جو دوسو صفحات پر مشتمل ہے) پڑھ کر ذہن نشین ہوتا ہے۔

باقی کلام مہجور کی مقبولیت (جو حضرت شاہ عبدالرحیم صفاپوری کی باطنی توجہ کا ثمرہ تھا) کے متعلق ان کے مشہور معاصر صاحبِ علم وفضل وصاحب تصانیف کثیرہ جناب علامہ محمد طیب صدیقی ضیغم کاشمیری (سابق پروفیسر ایس پی کالج) کا یہ تضمین بر مصرعہ غزل مہجور کو نقل کر کے اس مقدمۃ الکتاب کو پایۂ تکمیل پہنچاتا ہوں۔

اے مگس مگذر پروانہ رہِ جان بہ سیری
گوش جان واکن شنو این نکتہ پائے سرسری

شمع بزمِ داستان ہم جانفزا ہم جانستان
از کمانِ ابروش کے توانی جان بری
دل ربودن پیشہ و ہم بے وفائی شیوہ اش
دلبری غارت گری امّا بہ طرزِ دلبری
آہِ سرد و روئے زردم مے شود غمّازِ دل
ای نسیم روح پرور از کجا آیی جری

"ونتہ ہے وِس بے وفائی شیوہٗ دلدار چھا"
مے توان پُرسیدن از ضیغم ز راہِ خود سری

(رشحاتِ صرفیؔ)

مہجورؔ صاحب فراست بزرگ تھے۔ جناب شیر کشمیر شیخ محمّد عبداللہ نے اپنی آپ بیتی "آتشِ چنار" میں آپ کی جس پیش گوئی کا (برصغیر کے متعلق پانی پت کے میدان سے گذرتے ہوئے) ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ابھی وہ وقوع پذیر نہیں ہوئی لیکن حالات بتا رہے ہیں...... واللہ اعلم وعلمہٗ اتم۔ اس پر گواہ ہے۔

مجھے اُمید ہے تقریباً پوری ایک صدی کے بعد کتاب کی اشاعتِ دوم ہمارے لیے چشم کشا ہوگی۔ میں نے اس کتاب کا ۱۹۷۷ء میں حنفیہ عربک کالج شاہی مسجد مجاہد منزل کی اُس لائبریری میں مطالعہ کیا تھا جس کے لیے شیخ صاحب مرحوم و مغفور نے اوقاف اسلامیہ کی بلڈنگ انجمن تبلیغ الاسلام جموں و کشمیر کے نام عارضی طور وقف کی تھی۔ حضرت الاستاذ مفسرِ

قرآن امیر شریعت علامہ سید محمد قاسم شاہ صاحب بخاریؒ سے براہِ راست اکتسابِ فیض کے ساتھ ساتھ لائبریری میں دیگر کتب و رسائل میں حیاتِ رحیم بھی دستیاب تھی۔اس لیے جب جناب پیرزادہ ابدال مہجور صاحب نے دعوت تحریر دی تو کتاب کے خدوخال ذہن میں محفوظ تھے۔ناسپاسی ہوگی اگر میں مولانا غلام رسول صاحب شولا (ایم۔اے۔عربک) کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے مقدمہ کی پروف ریڈنگ کی۔والسلام الاحترام۔

شوکت حسین کینگ
سابق پرنسپل حنفیہ عربک کالج نورباغ
ٹرسٹی مسلم وقف بورڈ جموں وکشمیر
بانی انجمن حمایت الاسلام سرینگر

جنوری ۲۰۱۹ء

محمّد یوسف ٹینگ

تجزیاتی مطالعہ

زیرِ نظر کتاب اِس کے پہلے ایڈیشن کی بازگشت ہے۔ جو کوئی ایک صدی کے بعد چھاپی جارہی ہے۔ یہ راقم الحروف کی بے بسی اور لاچاری کا امتحان ہے کہ ایک تو حضرت شاہ عبدالرحیم قلندر صفا پوری کی باصفا حیاتِ مبارک پر مُجھ جیسے گناہ گار کو اِس پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے بلانا کیا کم بوجھ تھا اور وہ بھی میری موجودہ پیرانہ سالی کی حالت میں۔ دوسری یہ جسارت بلکہ گستاخی کہ جس کتاب کا مقدّمہ موجودہ کشمیر کے عالمِ بے بدل اور فاضلِ بے مِثل حضرت مولانا شوکت حسین کینگ جیسی محترم علمی شخصیت اور شیریں کلام میر واعظ نے تحریر فرمایا ہو۔ اُس کے پہلو میں مجھ جیسے گنوار کو شامل کرنا۔ بہر حال اِس فرمائش میں چونکہ حضرت مولانا کا ارشاد بھی شامل ہے۔ اس لئے اِس کی عدم تعمیل تقصیر عظیم سے کم نہیں۔

''حیات رحیم'' ایک عظیم المرتب قلندر کی حیاتِ پاک پر تحریر کی گئی تصنیف ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ اس کتاب کی تاریخی اور ادبی خصوصیات بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ جیسی بلند مرتبت شخصیت اور مقبول عام کشمیری شاعر کی تصنیف ہے۔ راقم نے آج سے کوئی تیس سال پہلے اِس پر ایک مختصر سا مضمون سپرد قلم کیا تھا اور وہ جریدۂ ''شیرازہ'' میں چھپ چکا ہے۔ میری دانست کے مطابق یہ اِس نایاب نثری تصنیف پر اِس نوعیت کا پہلا مقالہ تھا۔ ''حیاتِ رحیم'' کی ایک بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ کشمیری زبان بولنے والے کسی ادیب کی اردو زبان میں پہلی تصنیف تھی اور پہلی Biography یعنی سوانح بھی۔ اِس سے پہلے کشمیری پنڈتوں میں خاص طور پنڈت آنند کول بامزئی نے اِس نوع کی کچھ تصانیف انگریزی میں تحریر کی تھیں اور مسلمانوں میں منشی محمّد الدّین فوقؔ صاحب نے اردو میں ایسی بہت ساری کتابیں قلمبند کی تھیں۔ جن کو دیکھ کر علامہ اقبالؔ نے جو محمّد الدّین فوقؔ کے سیالکوٹ میں ہم عصر اور ہم شہر تھے کو ''مجدّد کشامرہ'' کہہ کر شرف بخشا تھا۔ فوقؔ صاحب کے آباو اسلاف اور بھائی بہن بھی علاقہ سوپور کے ہردوشیوہ کے رہنے والے تھے اور اُن کے بڑے بھائی غلام محمّد خادم نے شیخ محمّد عبداللہ کا قصیدہ بھی تحریر کیا تھا۔ لیکن فوقؔ خود کشمیری زبان میں کلام کرنے میں قادر نہیں تھے۔ حالانکہ اُنھوں نے کشمیری جاگیرداروں اور خوجگان کے دسترخوانوں پر کشمیری طعام مزے لے لے کر کھایا اور اُس کا لطف اٹھایا تھا۔

منشی محمّد الدّین فوقؔ مہجورؔ صاحب کے بڑے اچھے دوست تھے۔ عام

طور پر وہ 1944 عیسوی تک جب اُنکا انتقال ہوا، تقریباً ہر گرما میں چھ سات مہینے سرینگر یا دوسرے قصبوں میں رہائش اختیار کرتے تھے اور اکثر و بیشتر مہجورؔ صاحب کے ٹنکی کدل کے تین طاق والے مکان میں وقت گذاری کرتے تھے۔ یہاں اُن کا مہجورؔ صاحب سے بھی مسلسل تعلق رہتا تھا اور دونوں کشمیر شناس، کشمیر کی عظمت رفتہ، یہاں کے علوم و فنون، یہاں کی نامی گرامی شخصیات اور دوسرے منسلک معاملات پر تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے۔ چونکہ مہجورؔ صاحب کشمیری زبان اور اِس کی ادبی متاع کا گہرا احساس وادراک رکھتے تھے۔ اس لئے فوقؔ اُن سے بہت خوشہ چینی کرتے رہتے تھے۔ یہ کہنا شاید کچھ حضرات کو تھوڑا سا کڑوا لگے، لیکن مجھے خود مہجورؔ صاحب کے اکلوتے فرزند محمّد امین ابنِ مہجورؔ نے جو خود تاریخ و تقویم کشمیر کے بہت ہی جُزرس عالم تھے بتایا ہے کہ اُن کے والد بزرگ کے علاوہ خود اُنہوں نے بھی فوقؔ صاحب کی چند تحریروں کیلئے متن اور مواد اِکٹھا کر کے اُن کے سُپرد کیا ہے۔

اِس کتاب میں ہمارے ماضی و حال کی کچھ ایسی جھلکیاں نظر نواز ہوئی ہیں جسے اب ایک بڑے سامراج کے داوٗ پیچ نے اگر پوری طرح ختم بھی نہ کیا ہو، مگر بڑی حد تک گھنا اور دھندلا دیا ہے۔ مثلاً مہجورؔ صاحب ہر جگہ کشمیر کو ایک مُلک کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ جو واقعی تاریخ کی ابتداء سے لے کر چند دہائیوں پہلے تک ایک الگ تھلگ سلطنت ہی نہیں بلکہ ایک مالا مال اور شاندار تہذیب بھی تھی۔ جو اب بھی کچھ پرانی رمق دمق بچائے ہوئے ہے۔ ہمارے سماوار کا ثانی سارے ہندوستان میں نہیں۔ ہمارا امبری سیب صرف

کشمیر سے مخصوص ہے۔ ہریسہ کی نعمت جو ہمارے شدید جاڑوں کو پچھاڑتی اور ضیق النفس ہیں مبتلا کرتا ہے۔ صرف ہمارے یہاں بھاپ اُڑاتا اور کام و دہن کو لطف ولذت سے شرابور کرتا ہے۔ ناشپاتی کا ایک مشہور قسم ''ناکھ ٹنگ'' کے درخت صرف کشمیر میں ہی اُگتے ہیں، جس کی شیرینی کے مقابلے میں قند اور مصری کی مٹھاس ماند پڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہانگل کی پھُدک آہوئے نجد کو شرماتی ہے۔ ہماری تندوری روٹیاں ذائقے سے بھرپور ہیں۔ ہمارا گُلِ لالہ پندرھویں صدی میں یورپ اور ہالینڈ پہنچا اور وہاں سے پیوند پاکر Tulip کا سہاگ جوڑا پہن کر واپس آیا۔ ہمارے کانی شال اور ہمارے قالین کی دھوم آج بھی سارے جگت میں ہے۔ اس کی جھیلوں میں ''ندرو'' کے مقابلے میں باقی برصغیر کی یہی ترکاری گویا کسی پیڑ کی چھوٹی ٹہنیاں جیسی لگتی ہیں۔ ہمارا قہوہ ایک ایسا مشروب ہے کہ اُسکا سارے برصغیر میں جواب نہیں ہے۔ ہمارا ''مشکِ بُدج'' دھان ایسا ہے کہ اِس سے کستوری نافے کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے۔ ہماری لل دید کی شعری سوغات کا ساری دُنیا میں چرچا ہے۔ ہمارے شیخ العالمؒ کی فضیلتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ سارے ہندوستان کے بھگتی شاعروں سے ایک صدی پہلے اپنی نوائے وحدت سے فضا کو مشکبار بنا رہے تھے۔

مہجور کو کشمیر کی indentity کا جتنا گہرا احساس تھا، افسوس کہ آج کے شعراء تک کسی اور کو نہیں ہے۔ جسکا اظہار اُنکی کشمیری شاعری میں بار بار ملتا ہے۔

ژٕ لَلِتادَت تہٕ تأزی بٹ، مبارک خان پیدا کر

(تو للتا دتیہ، تازی بٹ اور مبارک خان جیسے سور ماؤں کو پھر جنم دے)

اِس کتاب میں مہجورؔ کا یہ تصور زیادہ وضاحت اور فصاحت سے گونجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ایران نے فردوسی کو پیدا کیا، جس نے ساٹھ ہزار اشعار میں وہاں کا ''شاہ نامہ'' لِکھا تو ہم نے ایک مسجد کے دیہاتی گدڑی پوش عبدالوہاب شائق کو پیدا کیا۔ جس نے اسی ہزار اشعار میں ''شاہ نامہ کشمیر'' تصنیف کیا۔ وہ ابنِ بطوطہ کی ممالکِ کی سیر و سیاحت کو ہمارے جامع الکمالات شیخ یعقوب صرفیؒ کے برابر گردانتے ہیں کہ حضرت ایشاں صاحب صرفیؒ نے بھی اُس زمانے میں بسیار دشت و دمن کی سیاحت کر کے وہاں عالموں اور شاگردوں کو فیض پہنچایا۔ مولوی رومیؒ کی مثنوی معنوی کے مقابلے میں وہ حول سرینگر میں آسودہ مرزا اکمل الدّین بدخشی کی مثنوی بحر العرفان کو شمار کرتے ہیں اور یہ بھی اُسی ہزار اشعار پر مبنی ہے۔ مہجورؔ کا کہنا ہے کہ اِسکا جواب روئے زمین پر نہیں۔ علامہ کمال الدّین کاشمیریؔ جو مشہور زمانہ عالم علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے اُستاد تھے۔ حضرت مجدد الفِ ثانی سرہندیؒ۔ شاہ جہان کے وزیر سعداللہ خان اور دورِ مغلیہ کے صدر الدّین آزردہ کا اُستاد قرار دیتے ہیں کہ آزردہ صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان کے اُستاد تھے۔ مہجورؔ صاحب نے کشمیر کی روحانی برتری کا

حال بتاتے ہوئے اِسے ''غارِ حرا'' تک کہہ دیا ہے۔ جو کشمیر کے متعلق اِس قسم کی پہلی اور آخری تشبیہ ہے اور جسکا مطلب اِس کے عابدوں اور زاہدوں کی ریاضت روحانی پر زور دے کر اِسکی شِدت کو اُبھارنا ہے۔ کتاب کی زبان صرف سلیس ہی نہیں بلکہ نہایت رواں دواں ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک صدی پہلے جب کشمیر کے علاوہ برصغیر میں مشکل پسندی اردو ادیبوں کا خاصہ تھی وہ اتنی برجستہ عبارت کیسے لکھ سکے۔

کتاب میں مہجورؔ کی صاف گوئی اور صداقت جوئی کا ایک اور منظر اُبھرتا ہے۔ وہ خود ایک پیرزادہ تھے بلکہ اُن کے آشنا اور رشتہ دار بھی اِس طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اِس طبقے سے تعلق رکھنے والے چند پیروں پر اگرچہ اُنہوں نے نام لے لے کر تیر نہیں برسائے، مگر بحثیت ایک طبقہ اِس کے چند افراد پر خاصی کڑوی تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام خام لوگ اُن کی ذات و صفات کے بدلے اُن کی پوشاک اور دوسری دنیاوی وسائل کی فراوانی سے اُن کی قدر کرتے ہیں۔ اُنہی کے الفاظ میں اُن کی سواری کیلئے بہت اچھے گھوڑے ہوتے تھے کہ اُن دنوں گاڑیوں اور موٹر گاڑیوں کی تقریباً قلعت تھی۔ اُنہیں کے الفاظ میں ''جس کے پاس زیادہ اچھا گھوڑا ہوگا، وہ زیادہ بڑا پیر ہوگا''۔ پیر صاحبان حکام کے پاس عام کسانوں کی سفارشیں کرتے ہیں اور اُس کیلئے کمیشن حاصل کرتے ہیں۔ اِس بارے میں اُنہوں نے خوب اور کھُل کے چوٹیں کی ہیں، جسکو قارئین گرامی خود پڑھیں گے اور چٹخارے لیں گے۔ اُن کی ان نگارشات کو پڑھ کر کشمیری زبان کے ایک اور

بڑے شاعر اور ''گُل ریز'' کے شاعر مقبول شاہ کرالہ واری کی یاد آتی ہے۔ جنہوں نے کوئی پچاس سال قبل اپنے ''پیر نامہ'' میں اِس سے بھی کڑے الفاظ میں اِس طبقے پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ حالانکہ وہ خود بھی اِس معزز طبقے کے ایک ممتاز شخص تھے۔

لگے پیرو کتابے وارِ وُچھ زٕم
کٹس کو کرس تہٕ گیٹس منگ ما چھم

(اے میرے مُرشد! آپ کے صدقے، کتاب میں اچھی طرح دیکھ کے بتائے کہ کہیں مجھے بھیڑو، مرغ یا مویشی کا صدقہ تو نہیں دینا ہے)۔

مہجور صاحب نے اس کتاب کے حوالے سے اُس وقت کے کشمیر کے چند مشاہیر کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے اِس کتاب کے نسخے کو دیکھا، بھالا اور سنبھالا۔ بلکہ زیورِ طبع سے آراستہ کرنے میں بھی مدد کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ خواجہ غلام احمد عشائی، جو ہماری اُس تحریک آزادی کے ایک مصدر تھے، جو آج تک جاری ہے اور ابھی تک اپنی منزل کے حصول کیلئے سرگرداں اور خون افشاں ہے، میری حقیر رائے میں اتنی طویل اور انسانی خون سے اسقدر فروزاں ایسی تحریک کہیں اور نہیں لڑی گئی ہے۔ کیونکہ یہ کشمیریوں کے تحت الشعور کے اِس ناقابل تسخیر جذبے سے اُبھرتی ہے کہ کشمیر ہمیشہ ایک آزاد وطن رہا ہے۔ اور اسکی آزادی اِس کی اصل منزل ہے۔

ہاں جرمِ وفا دیکھئے، کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار، سرِ دار کھڑے ہیں
موسم آیا نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور کا ہی بار آیا

مہجورؔ صاحب نے ''حیاتِ رحیم'' 1338 ہجری میں لکھی اور آج ہم 1439 ہجری میں اِسکا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ اصل کتاب کُل 128 صفحات پر محیط تھی۔ اِس کے صفحہ اول پر لکھا گیا ہے'' ولی کامل، سلطان الفقرا، تاج الاولیاء حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قلندر صفاپوری'' کی سوانح۔ یہ زیارت آج بھی مرجع خاص و عام ہے اور صفاپور کے خوبصورت نام کا یہ قصبہ انہی کی برکت سے شاد و آباد ہے۔ میرے پاکستان نشین کشمیری دوست خواجہ عبدالصمد وانی مرحوم اِسی جگہ کے رہنے والے تھے اور یہیں سے اُنہوں نے راولپنڈی ہجرت کی۔ لیکن بعد میں جب اَسی کی دہائی میں وہ کشمیر آتے رہے تو وہ بار بار اپنے آبائی گاؤں جاتے تھے۔ جہاں اُن کے ہم ذات وانی صاحبان کی بڑی تعداد آج بھی رہن سہن کرتی ہے۔ یہ سوءِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ وہ بیسویں صدی کے آخری دِن یعنی 31 دسمبر 1999 عیسوی کو راولپنڈی میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

خدا رحمت کُنا دایں عاشقانِ پاک طینت را

اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ وہاں سے اخبارِ ''کشیر'۔ Kashir'' نکالتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر کے اصل کشمیری نام کا یہ سب سے پہلا اخبار تھا۔ میں نے اُنہیں مشورہ دیا کہ ''کشیر'' کی مناسبت سے وہ اپنے ہفتہ وار کی پیشانی پر عصرِ حاضر کے سب سے بڑے کشمیری علامہ اقبالؔ کا یہ شعر لکھا کریں۔ ے

ازان مے فِشان قطرہ ای بر ''کشیری''
کہ خاکسترش آفریند شراری

''حیاتِ رحیم'' میں مہجورؔ نے شاہ عبدالرحیم صفاپوریؒ کے خلیفہ اوّل حضرت پیر غیاث الدّینؒ صاحب کا نام لیا ہے کہ حضرت اُن سے ہی اپنا احوال بیان کرتے تھے اور اعتماد رکھتے تھے۔ حضرت پیر غیاث الدّینؒ صاحب یارِ کلان تحصیل چاڈورہ میں سکونت پذیر تھے۔ اِنہی حضرت پیر غیاث الدّین صاحب نے مہجورؔ صاحب کو شروع میں اپنے بچوں کا اتالیق مقّرر کیا اور چند سال گذرنے کے بعد اُن کی شادی اپنی صاحبزادی مہتاب بیگم کے ساتھ کر کے اِنہیں گھر داماد کی حیثیت سے قبول کیا۔ مہتاب بیگم مہجورؔ صاحب کی 9 / اپریل 1952 عیسوی میں وفات کے بعد بہت عرصے تک اِس دنیاوی قفس میں رہیں۔ لیکن وہ ایک مجذوبہ کی سی پاک نہاد طبیعت رکھتی تھیں۔ (یاد رہے کہ ہم اپنی سب سے محترم کشمیری شاعرہ للِ دیدؔ کو بھی 'للِ مژی' کے نام سے پکارتے ہیں)۔ وہ بار بار واپس مائیکے لوٹ جاتی تھیں۔

مہجورؔ صاحب رقم طراز ہیں کہ خود اُنہیں حضرت رحیم صاحب قلندر کے ابتدائی حالات معلوم کرنے میں بڑی دقعتوں کا سامان کرنا پڑا۔ بلکہ اُس وقت کے کشمیر کے اَن پڑھ کشمیریوں سے اُنہیں بہت کم مواد حاصل ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب ظاہری سبیلیں ختم ہونے لگی تو قلندر کی کرامت ظاہر ہوئی۔ ایک دِن میں اُنہی کی زیارت کی ایک حجرہ خاص کوٹھری کے متصل کمرے میں محوِ خواب تھا کہ خواب میں خود حضرت رحیم صاحب جلوہ افروز ہوئے اور اُنہوں نے مجھ سے خود اپنی حیاتِ مبارک کے بارے میں فرمایا۔ جس کے مطابق وہ اُس سال پیدا ہوئے جب رنجیت چلا گیا (پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ جنہوں نے 1819 عیسوی میں کشمیر کے آخری افغان صوبیدار سردار جبار خان کو شوپیان کے نزدیک شکست دی اور کشمیر میں 27 سال کی سکھا شاہی کا وہ خونریز دور شروع کیا، جو پہلے ہی خون آشام کشمیر کے سب سے ظالم ادوار میں نمایاں ہے۔ مہجورؔ کو بتایا گیا کہ ''جب رنجیت جا رہا تھا تو میں آ رہا تھا'')۔ واضح رہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ 1839 عیسوی میں دنیا چھوڑ کر چلے گئے۔

حضرت رحیم صاحب کا معمول تھا کہ وہ اکثر مانسل کے عقب میں واقع ہلدر پہاڑی کی چوٹی پر اکیلے جاتے تھے۔ حالانکہ عام آدمی اِس پر چڑھتے ہوئے مشکل سے سانس لے پاتا ہے وہ وہاں کئی دِن اکیلے رہتے تھے۔ جنگلی درختوں کے پھل پر گذارہ کر کے ریاضت اور عبادت کرتے تھے۔ انہوں نے خود اپنی زندگی میں اپنے مقبرے کی عمارت تعمیر کروائی اور جب اُنہیں بتایا گیا کہ عمارت مکمل ہوگئی ہے تو اُنہوں نے کہا کہ ''لو ہم بھی

چلتے ہیں''۔اور اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کردی... ؎

دِل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکا لی دیکھ لی

''حیات رحیم'' مہجورؔ صاحب کے ادبی سفر کا ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اگر چہ اُنہوں نے اردو فارسی نویسی سے ہی اپنی قلم کاری کا آغاز کیا۔ اور وہ ''مستند تاریخِ کشمیر'' جس کا خاکہ اور چند نوشتے اُن کے لواحقین کے پاس موجود ہیں۔ بھی اردو میں ہی سپُرد قلم کرنا چاہتے تھے۔ جس کے لئے وقت کے وزیر اعظم شیخ محمّد عبداللہ صاحب اُنہیں اپنے ساتھ دِلی لے گئے تھے۔لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ 65 سال کی عمر میں کھلی ہوئی سرسوں کے زرد خوشوں کی لہلہاہٹ میں اِس جہانِ فانی کو چھوڑ کر اپنے پیر و مُرشد حضرت رحیم صاحب قلندر کے راستے پر سفر کرتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن اُن کی شاعری کے علاوہ اُن کی یہ اردو نثری تصنیف بھی اپنی اہمیت کو منواتی رہے گی۔ اگر اجازت ہو تو میں اُن کے ایک نہایت دلنواز شعر کے ساتھ اِن اوراق پریشان کی شیرازہ بندی کرلوں ؎

یأرِ ییٚلہِ واش کوٚڈ زلفِ پیچانن — گاش رٕوٚد ژوٗرِ دُر دانن منٛز
مُشک دار واو ژاو منٛز گلستانن — جاے تٕمۍ رٕٹ پرستانن منٛز

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر شاداب ارشد
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ فارسی، کشمیر یونیورسٹی

مہجورؔ و نالۂ مہجور میری دیدگاہ سے

شاعر کشمیر، پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ کی شہرت و معروفیت بحیثیت کشمیری شاعر ریاست و بیرون ریاست اظہر من الشّمس ہے۔ آپ کشمیر کے آسمانِ ادب کا وہ درخشاں ستارہ ہیں جنہوں نے اپنی بدیع نظم سے نہ صرف کشمیری زبان کو فصاحت و بلاغت کے درجۂ کمال پر پہنچایا، بلکہ ان کی شاعری میں کشمیری عاشقانہ غزل نے اسکی زیبائی اور لطافت کے آخری حد کو حاصل کیا۔ مہجورؔ صاحب کا شمار ان چند خوش نصیب شاعروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی جوانی میں ہی اپنی شہرت کی بازگشت سُنی ۔ یہاں تک کہ اس دور کے حکمران بھی ان کی ناماوری اور ادبی خدمات کو نظر انداز نہ کر سکے اور انکی ادبی خدمات کی داد و تحسین کے لئے اُن کو ''شاعر کشمیر'' کے لقب سے نوازا۔ انکی یہ ناماوری آج بھی اُسی شان اور آب و تاب کے ساتھ قائم و دائم ہے۔

مہجورؔ صاحب کا نام عام طور بیشتر لوگوں کے ذہن میں بحیثیت ایک کشمیری شاعر کے منقّش ہے۔ چند ہی ایسے ادب نواز ہیں جو انکی دیگر ادبی صلاحیتوں اور خدمات سے آشنا ہیں۔ نہایت مناسب مقام ہے کہ یہاں پر کشمیری شاعری کے علاوہ اُن کی دوسری ادبی جولانیوں کا بھی ذکر کریں۔ کشمیری زبان کے علاوہ مہجورؔ صاحب فارسی اور اُردو زبان و ادب کے میدانگاہ کے شاہسوار رہے ہیں۔ دونوں زبانوں میں اُن کے فن پاروں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے گفتاری و نوشتاری پہلوؤں اور خاص کر ادبی زبان تحریر کرنے میں کس قدر دسترس رکھتے ہیں۔ دونوں زبانوں میں اُن کے تحریر کردہ شعری و نثری ادبی شاہکار قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہیں اور چند ایک ادبی آثار زیور طبع سے آراستہ بھی ہوچکے ہیں۔ فارسی زبان میں اُن کا شاہکار تحقیقی کارنامہ "تذکرۂ فارسی شعرائے کشمیر" ہے جو کشمیر کے فارسی گو شعراء کے احوال زندگی اور منتخب نمونۂ کلام پر ایک نادر کتاب ہے۔ اس کتاب کا واحد قلمی نسخہ اُن کے اہلِ خانہ کے ذاتی کُتب خانے میں موجود ہے اور راقم السطور کی نظروں سے گذرا ہے۔ چونکہ تمام اہل علم اس امر سے واقف ہیں کہ کشمیر میں فارسی زبان و ادبیّات کا ایک درخشان ماضی رہا ہے اور سات سو سال پر محیط کشمیر کے فارسی ادب میں شاہمیری دور سے لے کر عصر حاضر تک ایسی بلند مرتبت شخصیات موجود رہی ہیں جن کے ادبی کارناموں اور فن پاروں کے گلوں کی عنبر و عبیر نے بیرون ملک تک کے ادبی گلشنوں کو مہکایا ہے۔ جن میں صرفی کشمیری، حبّی

کشمیری، غنی کشمیری، بابا داؤد خاکی، خواجہ محمّد اعظم دیدہ مری جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔ مہجور صاحب کے تحریر کردہ متذکرہ بالا تذکرے میں ملّا احمد کشمیری، جوسلطان زین العابدین بڈشاہ کے دربار کا ملک الشعراء رہا ہے، سے لیکر دورۂ متاخرین تک کے فارسی گوشاعروں کے احوالِ زندگی اور نمونۂ کلام کے انتخابات کونادر منابع و مآخذوں کے مطالعہ اور حوالہ جات سے اخذ کرکے اپنی ذاتی تحقیق کے بعد اس کتاب میں تحریر کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ادبی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

مہجور صاحب نے اپنی شاعری کی شروعات فارسی زبان میں لکھی ایک نظم سے کی ہے۔ جوانہوں نے ۱۹۰۵ء عیسوی میں ''انجمن نصرت الاسلام'' کے سالانہ جلسے میں پہلی بار باقاعدہ پڑھی[1]۔ شروعاتی دور میں حسین شاہ زیرک سے تصحیح کراتے تھے[2] اور اسی کی تجویز پر ۱۹۰۵ء میں ''مہجور'' بہ طور تخلّص اختیار کیا۔ انجمن نصرت الاسلام کے سالانہ جلسہ میں انہوں نے جو فارسی نظم پڑھی، نمونہ کے طور پر اس نظم میں سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

صد ھزاران شکر و منّت سوی درگاہ خدا — کار سازِ ھردو عالم یاورِ ھر دو سرا
آن خداوندی کہ دریک طرفۃ العین از عدم — در وجود آورد مھر و انجم و ارض وسما
ابن آدم را عطا کرد از ازل علم و ادب — تاکند فرق نمایان در صواب و در خطا
وردمی تاریکی و ظلم و جہالت گذا — کرد بس روشن بہ نورِ پاک آن شمس الھدیٰ[3]

---

[1] مہجور صاحب اس دور میں نصرت الاسلام سکول میں زیر تعلیم تھے

[2] حسین شاہ متخلّص بہ زیرک سرینگر کے اسلامیہ ہائی سکول میں فارسی کے مدرّس تھے

[3] پوری نظم کلچرل اکاڈمی، سرینگر کے کتابخانے میں قلمی نسخہ کی صورت میں محفوظ ہے۔

یہ فارسی نظم "کشمیری میگزین" میں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی ہے۔

چونکہ مہجور صاحب ایک علمی اور دینی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے اور خاص کر ان کی والدۂ ماجدہ سعیدہ بیگم، خود فارسی میں صاحب تصنیف رہی ہیں[1]۔ اس طرح سنِ طفولیت سے ہی ان کو ایک علمی و ادبی ماحول نصیب ہوا اور اس دور کے برگزیدہ اور جید علماء اور اساتذہ کی شاگردی اور صحبت حاصل رہی۔ پہلے عاشق ترالی کی صحبت اور بعد میں بسمل امرتسری، مولانا شبلی نعمانی، منشی محمّد الدّین فوق اور دوسرے شعراء کی ہمنشینی نے ان کی شاعرانہ طبیعت کو برانگیخت کر دیا۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے وادی کے مختلف مقامات پر قیام اور گونا گوں طبقاتِ انسانی سے اختلاط پیدا کیا۔ عام لوگوں سے میل جول کے اسی نتیجہ میں ان کی طبیعت میں تبدیلی پیدا ہو گئی جس نے ان کے شاعرانہ مذاق کو مزید جلا بخشی اور اُن سے اشعار کا ایک شیریں سمندر پھوٹ پڑا۔ چنانچہ اُن کے ہمعصر شاعر و تذکرہ نگار عبدالاحد آزاد، ان کی فارسی شعر گوئی کے متعلق لکھتے ہیں:

> "انہیں ایک دوست کو خط لکھنے کی ضرورت پڑی جو علم و فضل میں اپنا مقام رکھتا تھا۔ مہجور نے چاہا کہ منظوم خط لکھا جائے، چنانچہ فارسی زبان میں پچیس اشعار کا خط لکھا، جسکا آخری شعر یوں تھا۔[2]

---

[1] سعیدہ بیگم، بابا حضور اللہ کی نواسی تھی۔ اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب "اعتقاد نامۂ جامی" کا ایک قلمی نسخہ مہجور صاحب کے احفاد کے ذاتی کتاب خانہ میں موجود ہے

[2] کشمیری زبان اور شاعری از عبدالاحد آزاد، مطبوعہ، جلد ۳ ص ۲۶۳

شود نامِ من جمع کن یا یاد دار یک اندر دو چھار و چھل با چھار (احمد)[۶]

اس منظوم خط کے اشعار کے مطالعہ سے مہجور صاحب کی فارسی زبان وادب اور خاص کر شاعری پر انکی دسترس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ منظوم خط ان کی فارسی شاعری میں مہارت اور چیرہ دستی کا نمایاں ثبوت ہے۔ لداخ کے سالانہ میلے "بسنت پنچمی" کے موقعے پر ۱۹۰۹ء میں شاعر کشمیر نے ایک فارسی نظم کہی ہے جس کے دو شعر اہل ذوق کے داد کے لئے نمونے کے طور پر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ شاعر نے موقعہ کی مناسبت سے کتنے دیدہ زیب و متناسب الفاظ جیسے؛ نسیم نو بہار، بلبل، لالہ زار، دشت، کھسار کے ذریعے اس موقعے کی نوعیت کو اپنی شاعرانہ استعداد سے دوبالا کر دیا ہے:

بحمد اللہ بحمد اللہ نسیم نو بہار آمد بہ بلبل صد مبارک باد وقت لالہ زار آمد

گریزان شد دل تشویق و اندوہ پریشان بہ ھر سو نعرۂ شادی ز دشت و کھسار آمد

فارسی میں کہی گئی مہجور صاحب کی بہت ساری نظمیں بدقسمتی سے زمانہ کی نظر ہو گئی ہیں۔ البتہ چند نظموں کے اشعار اخبار "مارتنڈ" کی فایل میں موجود ہیں۔ اسی میں اُن کی لکھی ہوئی ایک نظم "گل ویرانہ" جس کا دوسرا نام "بی وسیلہ" ہے، موجود ہے[۷] اس نظم کے چند شعر پیش خدمت ہیں:

دوش سوی سیر صحرا شد خیالم راہبر مثلِ مجنون رہ نوردِ دشت گشتم بی خطر

در چمن گلھای گونا گون بہ صف آراستہ وز پیِ انجامِ خدمت باغبان بستہ کمر

۶۔ تخلص کا استعمال نہ کر کے معمہ کی صورت میں اپنا نام "احمد" لکھ دیا ہے

۷۔ اخبار مارتنڈ، ۲۷ چیت ۱۹۹۱ بکرمی

گر گلی پژمردہ گردد از تموزِ آفتاب باغبان او را کند سیراب از خونِ جگر
گرد آلودہ شود گر چہرۂ گل ناگہان می کند سرِ شوبی از آبِ دیدہ زود تر[۱]

اب جن اشعار کی طرف میں اہلِ ذوق کی توجّہ مرکوز کرانا چاہتا ہوں، اُن میں مہجور صاحب کے اپنے منفرد سبک کا احساس بھی موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ علاّمہ اقبال کے اسلوب کی بھی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان اشعار میں کشمیری شاعر سوچھہٕ کرال کے شکوہ اور جواب شکوہ کے تخیّل کی بھی گونج سنائی دے گی۔ اس کے باوجود مہجور صاحب کے اشعار میں جدت ہے اور اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ اشعار اُن کے بہترین اشعار میں سے ہیں۔ ان اشعار میں اُن کا انداز بیان اور الفاظ و تراکیب کا موزون استعمال، نظم کے لطف و جاذبیت کو دوبالا کرتا ہے۔ اشعار ذیل اسی حقیقت کی غمّازی کرتے ہیں:

گفت ای مہجور از نیرنگی چرخِ کہن نیستی تو گر ندانی حیلۂ این حیلہ گر
خار و خس در صحنِ گلشن، لالہ اندر کوہسار سینۂ او داغدار از کسمپرسی خم نگر
سنگ درون قصر شاہی ہست بر فرش سریر شیر نر در غار کہنہ برزمین افگندہ سر
شکوۂ جورِ فلک پامال مضمعدن قدیم ترک کن بین سوی خودای صاحب علم و ہنر
حضرت انسان کو لاف انا الحق می زند می شمارد ذات خود را از فلک پاکیزہ تر
لیک در تنظیم انسان این تماشا دیدہ ام ہا قلی محتاج لطفی ابلۂ شوریدہ سر[۲]

''شہر آشوب'' کے عنوان سے مہجور صاحب نے ایک نہایت

---

[۱] اخبار مارتنڈ، ۲۷ چیت ۱۹۹۱ بکرمی
[۲] ایضاً

دلچسپ نظم لکھی ہے جس میں انہوں نے کشمیر کے عام لوگوں پر روا رکھے گئے اس دور کے حاکموں کا حال، ایک منفرد اور جاذب شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازاین محکمۂ مال کے ماضی اور حال کی کیفیت کا بھی اس نظم میں نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس نظم کے مطالعہ سے یہ بات بالکل عیان ہو جاتی ہے کہ مہجورؔ صاحب نہ صرف قدرتی مناظر کی عکاسی، بزمی، عاشقانہ یا متصوفانہ شعر لکھنے پر ہی ید طولا نہیں رکھتے بلکہ وہ کسی بھی خشک مضمون کو اپنے جادوئی انداز بیان سے آبدار بنا دیتے ہیں۔ اس نظم سے منتخب یہ دو شعر قابل غور ہیں:

خطۂ کشمیر اوّل ہمچو فردوس برین   از سرِ سرلارنس[1] یکسر ہمہ گلزار شد
دفع شد جورِ سزا ور فعِ ظلمِ کاردار   از تفنگ معدلت شق سینۂ شقدار شد[2]

چند تاریخی قطعے بھی ان کے خامۂ سحر آمیز کی یادگار ہیں جو تاریخی نکتۂ نگاہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر جریدۂ ''نظام'' کے رسم اجراء کے موقعہ پر ان کا لکھا ہوا یہ قطعہ:

کیست نظام آن کہ پذیرد وبہ کام   از سر حق ملک حقایق نظام
آن کہ ز انفاس سی صفات   ملّت و دین یافت نظام حیات
بے دل سر بزم یارگشتن گناہ مہجورؔ   شیشہ بہ یک نگاہ شکستن گناہ کیست؟[3]

---

[1] سر والٹر لارنس، کشمیر کے سابق سٹلمنٹ کمشنر رہے ہیں
[2] منتخب از اخبار مارتنڈ
[3] جریدۂ نظام، سرینگر اپریل ۱۹۱۹ء

انہوں نے فارسی شاعری کی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کہی ہوئی شیرین فارسی رباعیاں مضمون آفرینی اور انداز بیان کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند رباعیاں اہل ذوق کی داد طلبی کے لئے نقل کررہا ہوں:

صد مبارک بر کلاہ و بر قبای سروری　　بخت و تخت عزّ و دولت مژدۂ نیک اختری
زبان آمد کہ یارب در ترقّی روز و شب　　بر سپھرِ نور، دور کوکبِ اسکندری

☆

ای عمرم می شود ضایع اگر　　ساعتی با من نہ سازی التفات
می روم آخر کہ داغی بر دلم　　باشد چون لالہ اندر عرضیات

☆

عاشق و معشوق چون راضی شوند　　پردہ ھای ننگ و ناموس درند
چون شوند راضی بہ قاضی نیست کار　　اختیار است اختیار است اختیار[1]

☆

اُردو زبان میں شاعر کشمیر، مہجورؔ صاحب کا شاہکار کارنامہ اُن کی تصنیف ''حیات رحیم'' ہے جو دراصل مہجورؔ صاحب نے اپنے روحانی پیشوا، صوفی بزرگ جناب حضرت سُلطان الفُقراء، تاج الاولیاء، رحیم شاہ صاحب، صفا پوری کی حیات مبارکہ اور کشف و کرامات سے متعلق ۲۴ عنوانات کے تحت لکھی ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ اور مقدّمہ بھی انہوں نے

[1] جریدۂ نظام، سرینگر، اپریل ۱۹۱۹ عیسوی

خود ہی تحریر کیا ہے۔ چونکہ کتاب نثر میں لکھی گئی ہے تاہم کتاب کا اصل موضوع شروع کرنے سے قبل مہجورؔ صاحب نے پچاس ۵۰ اشعار پر مشتمل فارسی زبان میں ایک مثنوی ''نالۂ مہجورؔ'' کے عنوان سے نظم فرمائی ہے۔ یہ مثنوی مولانا رومؒ کی مثنوی معنوی کی بحر یعنی بحر رمل مسدّس مقصور (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات،(-u-/--u-/--u-u) میں لکھی گئی ہے جو مثنوی کی معروف ترین بحروں میں سے ایک ہے۔ مثنوی کے ابیات کو پڑھ کر اہل علم و ذوق نہ صرف مہجورؔ کی شاعرانہ عظمت، شیرین سخنی اور افکار و عقائد سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا مناسب ہوگا کہ یہ شاعر کے بہترین کلام اور گراں بہا افکار کا نمونہ ہے۔ ''نالۂ مہجورؔ'' کو اگر ''حیات رحیم'' کا ایک منظوم تلخیص کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ''نالۂ مہجورؔ'' ایک اعلیٰ ترین عارفانہ مثنوی ہے جس کا ایک ایک لفظ حضرت اقدس کی عظمت کی غمازی کرتا ہے۔ اور مہجورؔ صاحب کا آپ حضرت کے ساتھ والہانہ عقیدت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ عقیدتمندانہ اشعار آنے والی نسلوں خاص طور سے آنخضور کے محبوں اور عقیدتمندوں کو آپ حضرت کی شان مبارک سے روشناس کراتے ہیں۔ اگر چہ حضرت اقدس کی شان عظمت کی مدحت و تعریف میں نظم و نثر میں آپکے عاشقوں نے اوراق تحریر کئے ہیں لیکن واقعی نالۂ مہجورؔ اس سمت میں اپنی مثال آپ ہے۔ شاید مہجورؔ صاحب جن حساس جذبات کو نثر میں بیان کرنے سے خود کو روک پائے، اُن اعلیٰ جذبات اور احساسات کو انہوں نے شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ چونکہ والہانہ عشق و جذبات اور ارادت و احساسات کو جتنا

مؤثر انداز میں شعر کے توسّط سے بیان کیا جا سکتا ہے شاید نثر میں وہ گنجائش موجود نہیں ہے۔ جہاں تک اس مثنوی کے موضوع یعنی ''نالۂ مہجور'' کا تعلق ہے، شاعر نے صرف دو لفظوں میں اس بات کا خلاصہ کیا ہے کہ وہ اپنے حقیقی معشوق کی جدائی و فراق اور مہجوری میں کس قدر جان بہ لب ہے۔ مثنوی کے ابتدائی ۲۵ ابیات اُسی معشوق معنوی کی عظمت معنوی، دست قدرت، تعریف و توصیف اور اوصاف عالی پر مبنی ہیں۔ چند اشعار میں مولانا رومیؒ کا بھی ذکر ملتا ہے جو مضمون کے اعتبار سے استادانہ روش سے پیوند کئے گئے ہیں۔ بعد کی چند ابیات دعا و عرض و نیاز پر مبنی ہیں۔ تقریباً ۳۸ اشعار مثنوی کے ان ہی موضوعات پر محیط ہیں گویا کہ یہ مقدّمہ و مدح کے شعر ہیں۔ پھر اگلے دس بارہ ابیات میں ''نالۂ مہجور'' کے مرکزی خیال اور اپنے جذبات کو شاعر نے بہت رقیق اشعار میں بیان کیا ہے جن کا محور اپنے معشوق حقیقی کے وصال سے دوری و مہجوری قرار پاتا ہے۔ مہجور صاحب نے مثنوی ''نالۂ مہجور'' کا اختتام مولانا رومؒ کے ایک معروف شعر سے کیا ہے جو اس مثنوی کے مرکزی خیال کو مؤثر بناتا ہے۔ چند دیگر صوفی شعراء نے بھی اس شعر کو تضمین کے طور پر استعمال کیا ہے۔

معمولاً فارسی صوفی شعراء نے اس طرز و نوعیت کے مضامین کو ادا کرنے کے لئے جس شعری قالب کا استعمال کیا ہے وہ قصیدہ ہے لیکن معمول کے برعکس مہجور صاحب نے مثنوی کے قالب کا انتخاب کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ وہ مولانا روم کی مثنوی معنوی اور خاص کر اس مثنوی کے تمہیدی

اشعار یعنی ''نی نامہ'' سے متاثر نظر آتے ہیں، جو مثنوی معنوی کے مرکزی اشعار یا مغز مثنوی ہیں اور تمام مثنوی اسی ''نی نامہ'' کی شرح و تفصیل میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ اثر و نفوذ صرف قالب شعر تک محدود ہے اور جہاں تک اسلوب، طرز بیان اور مطالب کا تعلق ہے، مہجور صاحب کا سبک اور انداز بیان منفرد ہے۔ اس مختصر مثنوی میں انہوں نے بہت ساری خود ساختہ تراکیب کا استعمال کیا ہے جن سے شعر میں ایک تازگی پیدا ہوگئی ہے جیسے ،صبا رفتار، مرغِ دلفگار، ہوش حق فروش، گدای جنس رنج، جام گدایی ، دیوان نیاز، لنگر افگن، جواب نوشتن، منزل بردن وغیرہ۔ اسکے علاوہ انہوں نے نالۂ مہجور کے لئے جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک نولکھا ہار کیلئے چُننے ہوئے نگینوں کا انتخاب ہوا ہے۔ اس کے علاوہ زور قلم شروع سے لیکر آخری شعر تک برقرار رہا ہے کہیں بھی بھرتی کے ابیات نظر نہیں آتے۔ معنی و مطالب جو اس مثنوی کا روح روان ہے، ایک قاری کی وجدانی کیفیت کو برانگیخت کرتا ہے اس میں عشق حقیقی اور خالق کائنات کے قریب تر ہونے کے احساس کو جگا تا ہے۔ یہی اس مثنوی کا اصل مدعاء و مقصد بھی ہے اور شاعر اپنے مقصد اور پیغام کو پہنچانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ترجمہ و تحلیل متن نالۂ مہجور:

باجسارت ، چونکہ تمام اہل ذوق اور عاشقان حضرت اقدس، فارسی زبان سے اس قدر مانوس نہیں ہیں کہ اس مثنوی کے ہر شعر سے حظ حاصل

کریں اسلئے اُن حضرات کی سہولت کے لئے مثنوی کا اردو زبان میں ترجمہ پیش کرنا لازمی ہے۔ لیکن راقم السطور کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ ترجمہ کبھی بھی اصل متن کے اندر مضمر جذبات و احساسات کی عیناً ترجمانی نہیں کرسکتا، لیکن کسی حد تک اس تک رسائی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

مثنوی نالۂ مہجور کے شروعاتی اشعار اُس روحانیت کے بحرِ بیکران اور واقف اسرار الٰہی، جناب حضرت سلطان الفقراء، تاج الاولیاء، بادشاہ بہرو براور راہنمائی راہ ھدیٰ کی روحانی شان وشوکت، فیوض باطنی، شانِ کرم و عنایت کو نہایت ادب و احترام اور ذوق وشوق کے ساتھ سمجھانے کی مؤثر کوشش ہے۔ ان اشعار میں آنجناب کو طبیب دانا، چارہ ساز، حقیقت دان، مخزن علم و ہنر، دستگیر بے کساں، واقف اسرار عرش ولا مکان، غم ربای، شکر زبان، ماہر اسرار سروری، راز دانِ شوکت پیغمبری، مرسل سلطان خوبان جیسے اوصاف عالی والقاب سے پکارا گیا ہے۔ جو آنحضور کی ذات اقدس کے بالکل شایان شان ہیں۔ ان اشعار میں حضرت اقدس کو روح کی تمام علالتوں وخرابیوں اور جسم کی جملہ بیماریوں اور کمزوریوں کے واسطے حکیم حاذق وطبیب دانا مانا ہے۔ تقریباً آدھے سے زیادہ اشعار، مثنوی کے حضرت اقدس کی معنوی عظمت و بلند مرتبت کی مدحت وتعریف میں کہے گئے ہیں۔ ان ابیات کو پڑھ کر واقعاً ایک کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور جناب سلطان الفقراء کی روحانی ومعنوی عظمت کا احساس ہوجاتا ہے۔

۱) اے بادِ صبا کا خُلق رکھنے والے خوش رفتار قاصد، آپ کلام میں

پوشیدہ (کلام الٰہی) لعل و گوھر کے امانت دار ہیں۔

۲) اے صبر و قرار کے دوام کو قائم رکھنے والے، آپ محزون و غمگین دلوں کو صبر و تحمّل بخشنے والے ہیں۔

۳) اے ساقی عرفان کے امانت دار، آپ اُن دلوں کے خریدار ہیں جن دلوں نے اپنا صبر و قرار کھویا ہو۔

۴) اے حرص و لالچ کے تمام امراض کے طبیب، آپ ہی عاجزوں اور بیکسوں کے چارہ ساز ہیں۔

۵) اے خیر و شر کے راز کی حقیقت کو جاننے والے، آپ علم و ہنر کے خزانوں کی کنجی ہیں۔

۶) آپ روح کے درد وغم اور جسم کے رنج والم کے لئے باعث شفا ہیں۔ آپ ہی میرے ہمراز اور میرے رفیق ہیں۔

۷) آپ عاشقوں کی خلوت و تنہائی میں اُن کے ہمدم ہیں۔ آپ عاجزوں اور بیکسوں کے محبّ و دستگیر ہیں۔

۸) آپ کی ایک نظر، زخم جگر کا مرہم ہے۔ آپ کے لب سر بہ سر تریاق ہیں۔

۹) آپ کا پیغام عقل و ہوش میں رخنہ و شگاف ڈالنے والا ہے۔ آپ عقل ظاہر بین اور فہم و ادراک حق عطا کرنے والے ہیں۔

۱۰) آپ رنج و درد و غم جیسے اسباب کی گدائی لینے والے ہیں۔ آپکی ہتھیلی میں جام گدائی تو جامِ جم ہے۔

۱۱) جان بہ لب عاجزوں اور ناتوان کے لئے آپ زندگی بخش ہیں۔ سوزِ دل کی آہ وفریادوں کا علاج آپ ہی ہیں۔

۱۲) آپ عرش و لا مکان کے واقف اسرار ہیں۔ درحقیقت آپ فرشتگان مقرّب سے بھی نزدیک تر ہیں۔

۱۳) آپ میرے محبوب کی منزل کے راہی ہیں۔ آپ کی گردِ راہ پر میری جان قربان ہے۔

۱۴) آپ مضطرب و بے قرار عاشقوں کے غموں کو دُور کرنے والے ہیں۔ آپ مسافرت میں بادصبا سے بھی زیادہ سریع السیر ہیں۔

۱۵) آپ محبوب دلنواز کے کوچہ سے محرم وآشنا ہیں۔ آپ ضرورت و نیاز کے دفتر کو بھی درس دینے والے ہیں۔

۱۶) آپ درد جدائی وفراق کی لذّت سے آشنا ہیں۔ آپ ہی شوق و آرزو کے سمندر کے غوطہ ور ہیں۔

۱۷) اے میرے عندلیب، ہُد ہُد اور شہباز، آپ شکر زبانی سے جادو بکھیرتے ہیں۔

۱۸) آپ شان سروری کے ماہر اسرار ہیں۔ آپ پیغمبری کی عظمت و مرتبت کے راز دان ہیں۔

۱۹) آپ زنجیر جنون کو استحکام و پایداری بخشنے والے ہیں۔ آپ ضمیر و دل (باطن) کے پوشیدہ احوال کو درک کرنے والے ہیں۔

۲۰) آپ امید وآرزوؤں کے مجسّم اور تصویرِ سُرور ہیں۔ آپ وجود و

ظہوراورقرابت کی وادی کے شاہسوار ہیں۔

۲۱) آپ جدائی وفراق کے سمندر میں روان کشتی کو پار لگانے والے کشتی بان (ناخدا) ہیں۔آپ نو (۹) آسمانوں کے سرِ و اسرار کی پردہ پوشی کرنے والے ہیں۔

۲۲) آپ دیدار و وصال کے حرم کی طرف جانے والے راستے کے راہنما ہیں۔آپ حسن و زیبائی کے باغ و بوستان کے باغبان ہیں۔

۲۳) آپ آنکھوں کے لئے سُرمہ ہیں اور دور اندیش و بابصیرت نگاہ والے ہیں۔آپ دلربا محبوب کے حسن و جمال کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

۲۴) آپ کائینات کے ساز پر نغمہ و گیت سجانے والے ہیں۔اے پیالۂ شرابِ حیات کے ساقی، آپ پر آفرین ہو۔

۲۵) آپ کی جائے آرام (یعنی آستانۂ پرانوار) حق کے نورِ انور کی تجلّی گاہ بن گئی ہے۔آپ سے فیض حاصل کرنے والوں نے اپنی اپنی منزل مقصود کو حاصل کیا۔

۲۶) آپ دنیا میں پادشاہانِ حسن و جمال کے پیغمبر ہیں۔آپ لطف و کرم وعنایت واحسان کا مقام لامحدود ہیں۔

اگلے تین ابیات میں مہجور صاحب نے مولانا رومؒ کا ذکر بہت احترام سے کیا ہے۔اور آپ کو ''عاشق سرباز'' اور ''دُرّکش دریایِ علوم'' جیسے صفات

عالی سے یاد کیا ہے۔ ان اشعار میں مہجور صاحب نے مولانا کی مثنوی معنوی کا حوالہ دیکر لکھا ہے کہ ''عشق حقیقی'' کے پیغام کی شرح و تفصیل میں مولانا نے مثنوی کے چھ دفتر تحریر کئے لیکن پیغام مکمل نہ ہوسکا۔ مولوی کے ''نی نامہ'' سے یہاں پر اس موضوع پر یہ اشعار موقعے کی مناسبت سے قاری حضرات کی نظر کرانا چاہتا ہوں، ملاحظہ ہو:۔

هرکه را جامه زعشق چاک شد	او ز حرص و عیب کلّی پاک شد
جس کا جامہ عشق کی وجہ سے چاک ہوا	وہ حرص وعیب سے بالکل پاک ہوا
شاد باش ای عشقِ خوش سودای ما	ای طبیبِ جمله علّت های ما
خوش رہ، ہمارے اچھے جنون والے عشق	اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب
ای دوای نخوت و ناموس ما	ای تو افلاطون و جالینوس ما
اے ہمارے تکبّر اور عزّت طلبی کی دوا	اے کہ تو ہمارا افلاطون اور جالینوس ہے
جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد	کوه در رقص آمد و چالاک شد
خاکی جسم عشق کی وجہ سے آسمانوں پر پہنچا	پہاڑ ناچنے لگا اور ہوشیار ہوگیا[۱]

۲۷) ایسا کون ساشخص ہے؟ جس میں ایسی قوّت ولیاقت ہوگی کہ اُس عالی جناب کی جانب سے پائے ہوئے آپ کے پیغام کا جواب لکھ سکے؟

۲۸) علم و دانش کے سمندر میں غوطہ لگا کر اسکے موتی چننے والے جانثار عاشق، مولانا رومؒ نے........

---

[۱] مثنوی مولوی معنوی از مولانا جلال الدّین رومیؒ؛ مترجم قاضی سجاد حسین، انتشارات الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار لاہور، پاکستان ۱۹۷۴م، ج۱، ص۳۳

۲۹) جب آپ کے پیغام کا جواب دینا چاہا تو جواب میں (مثنوی معنوی کے) سات دفتر تحریر کرڈالے، پھر بھی جواب نامکمل رہا۔

ابیات مابعد میں مہجور صاحب، حضرت اقدس کے حضور میں عاجزی و عرض و نیاز کے ساتھ دست بہ دعا ہیں کہ عرش و لامکان کی سیر سے ذرا فرصت نکال کر اپنے تشنہ لب عاشقوں، بے قراروں اور شیداؤں کو بھی اپنا شربت دیدار نوش کرائیے۔ اور ان کو عشق حقیقی کے نور سے منوّر کیجئے تاکہ اُن کے افسردہ دل کلی کی طرح کھل اٹھیں۔ شاعر اُس خوش نصیب دن کی تمنا بھی ظاہر کررہا ہے جب اس عاشق و بے قرار کی طرف آنحضور التفات فرما کر اُن کی اور تشریف فرما ہونگے۔

۳۰) اے سب سے بہتر و بالاتر، ہماری طرف ناز و ادا سے تشریف لائے اور اُن حضرت سے آپ نے کیا پیغام لیا ہے اس کے بارے میں ہمیں بھی آشنا فرمائیے۔

۳۱) اے عاشقوں کے نورِ جان، لمحہ بھر کے لئے عرش ولامکان کی سیر و گردش کو چھوڑ کر ہماری طرف لوٹ آئے۔

۳۲) آپ نے گلشن سے ہزاروں لاکھوں گل چُن لیئے۔ آپ نے اپنے جامۂ مبارک کے اندر کتنے باغھا پوشیدہ رکھے ہیں۔

۳۳) بحرِ عشق کے ساحل پر توقّف فرمایے اور شہر عشق کے اندر طلاتم برپا کیجئے۔

۳۴) دیوانے بلبل کو گُل کی یاد دلائیے اور دل پروانہ کو جلنے کی لذّت عطا

کیجئے۔

۳۵) جہانِ مجبور کی خاک سے بنے ہوئے انسان کو قوّتِ پرواز عطا کیجئے اور اسکی کھوئی ہوئی طاقت وصلاحیّت کو دوبارہ لوٹا دیجئے۔

۳۶) وہ دن کتنا ہی خوش نصیب ہوگا جس روز آپ ہماری طرف تشریف لائیں گے جس طرح گلشن کی طرف بادِ نو بہار رخ کرتی ہے۔

۳۷) تاکہ میرا کلی جیسا افسردہ و پژمردہ دل، اپنی شرمساری کو چھوڑ کر اپنا سر فخر سے اونچا کر لے۔

۳۸) ہم عرصۂ قدیم سے محبوب ازل کے عاشق وشیدا ہیں۔ یہ معمّا آپ کے بغیر کیسے وکب حل ہوسکتا ہے؟

مثنوی کے آخری اشعار میں مہجور کے ''نالۂ مہجور'' کا مرکزی خیال، احساسات و جذبات درونی موجود ہیں جو نالہ وگریہ وفریاد بن کر شعر کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ دراصل نالۂ مہجور کا تانہ بانہ حضرت اقدس کے وصال سے دوری، فراق، جدائی ومہجوری سے تیار کیا گیا ہے اور آنحضور سے اظہارِ فراق اور آہ وزاری کا ایک وسیلہ ہے مثنوی ''نالۂ مہجور''

۳۹) اگر میں ہجر یار کی داستان بیان کرنا شروع کردوں تو یہ قصّہ روز قیامت (روز حساب) تک بھی ختم نہیں ہو پائے گا۔

۴۰) لیکن میرا جسم دردِ اشتیاق کی وجہ سے، سر سے لیکر پاؤں تلک ہجر و فراق کا مجسم بن گیا ہے۔

۴۱) اسکی نگاہ ناز سے میں عاشق شیدا بن گیا۔ راہِ عدم کے لئے بس یہی

میر ازادِراہ ہوگا۔

۴۲) میں اسکے وصل و دیدار سے دور و مہجور رہا۔ میری روح کب اُس مقام کیف وسرور تک پہنچ جائے گی۔

۴۳) اگرچہ میں اس کے وصل سے دور ہوں لیکن دوری کا غم کیوں کرنا، میں اپنے معشوق کے گلستان کا بلبل ہوں۔

اگرچہ حضرت اقدس کے حسن و جمال و کمال کا جلوہ ظاہر بین آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے اور بے بصیرت ظاہری آنکھیں اُس آفتاب نور کا مشاہدہ کرنے سے قاصر و عاجز ہیں لیکن دل کی آنکھوں میں نور بصیرت رکھنے والے عاشقوں اور دلدادگان ناز دلربا کے لئے حسن و جمال یار ہر طرف جلوہ گر ہے۔ جیسے حافظ نے فرمایا ہے:

ھر دیدہ جای جلوہ آن ماھپارہ نیست   اورابہ چشم پاک توان دید چون ھلال

۴۴) حسنِ یار ہر طرف سے جلوہ گر ہے۔ لیکن ظاہر بین آنکھیں اسکو دیکھنے اور اسکا مشاہدہ کرنے سے قاصر ہیں۔

۴۵) ظاہری عقل کے حجاب نے میری آنکھوں کو سی کر بند کیا ہے۔ اے دنیا و جہان کو منوّر کرنے والے روشن ستارے، آپ سے مدد کی درخواست ہے۔

عاشقوں اور شیداؤں کے لئے ذکر و فکر محبوب حقیقی میں محو رہنا، دین وایمان ہے۔ اور معشوق معنوی کے اسم مبارک کا ذکر ہی اُن کے لئے اسم

اعظم اور بہترین عبادت ہے۔ چونکہ ذکر و فکر دلبر، دلدادگان محبوب کے لئے قوّت جان وتن ہے۔ یہی سبب ہے کہ عاشقان حضرت اقدس ہر درد وغم اور رنج و بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور یہی والہانہ عشق و عقیدت اور ذکر و فکر محبوب، اُن کو اپنے کعبۂ مقصود سے قریب تر کر دیتا ہے۔ پھر ایک عاشق صادق کسی کی انگشت نمایی اور نکتہ چینی سے بے فکر و بالاتر ہو جاتا ہے۔

۴۶) عاشقوں کا دین و ایمان محبوب کی یاد میں محو رہنا ہے۔ اور ذکر و عبادت سے بہتر محبوب کے نام کا ورد کرنا ہے۔

۴۷) محبوب کا ذکر، عاشقوں کی روح کو قوّت بخشتا ہے اور جسم کی محافظت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر غم سے محفوظ وامن وامان میں رہتے ہیں۔

۴۸) اے نکتہ چینی کرنے والے، اگر تو عاشقوں کی عیب گیری کرتا ہے تو کوئی غم نہیں۔ کیونکہ عاشقوں اور دیوانوں پر اسکا کوئی اثر نہیں۔

مہجور صاحب نے مثنوی ''نالۂ مہجور'' کو ''یاد الست'' سے اختتام کو پہنچایا ہے۔ الست، روز الست، عہد الست یا میثاق عالم ذر یا میثاق اوّل۔ ایک عہد و پیمان ہے جس کا اقرار اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر حضرت آدمؑ یا بنی آدمؑ سے لیا ہے۔ جس کا اشارہ قرآن پاک میں صورہ اعراف، آیت نمبر ۱۷۲ میں خداوند تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے (ترجمہ: اور جب آپ کے رب نے اولاد آدم کی پشت سے اُن کی اولاد کو نکالا اور اُن سے اُن ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے جواب دیا

کیوں نہیں ہم سب اس واقعہ کے گواہ بنتے ہیں تا کہ تم لوگ قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے)[۱] اسی مناسبت سے حافظ شیرازی کا ایک شعر ہے:

مطلبِ طاعت و پیمان و صلاح از منِ مست — کہ بہ پیمانہ کشی شہرہ شدم روز الست

من ھمان دم کی وضو ساختم از چشمۂ عشق — چار تکبیر زدم یکسرہ برھر چہ کہ ھست [۲]

(ترجمہ: مجھ مست سے اطاعت وعہد و پیمان و شایستگی کا مطلب مت پوچھ، کیونکہ میں روزِ الست سے ہی شراب نوشی میں مشہور ہوں۔ میں نے اسی وقت سے جب سے عشق کے چشمے سے وضو بنایا، ہر موجود پر ایک دم سے چار تکبیر (جنازہ وترک تعلق) پڑھ لیئے)

۴۹) اے عرش پر آشیانہ رکھنے والے پرندے، آجاؤ اور مجھے معشوقِ دلبر کا پیغام دو

۵۰) تمہارے پیغام سے میرا دل سرشار و سرمست ہو گیا۔ تو نے روح کو ''عھد الست'' کی یاد دلا دی۔

نالۂ مہجور کے اختتامیہ شعر کے بعد مہجور صاحب نے مولانا رومؒ کے ایک مشہور شعر کو ایک خاص مقصود سے نقل کیا ہے شعر کا ترجمہ یوں ہے:

آپ نجد و یاران نجد کے قصّہ کو دوبارہ دہراؤ تا کہ در و دیوار پھر سے وجد میں

---

۱ نسخۂ قرآن کریم عکسی، مترجم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی؛ مطبوعہ گا با سنٹر، اردو بازار، کراچی، پاکستان۔

۲ خرمشاھی، بہاالدّین، حافظ نامہ (۲ مجلّد) انتشارات علمی و فرھنگی، تھران، چاپ اوّل ۱۳۶۶ھ۔ ش ج ا۔ ص ۲۰۶

آجائیں۔

مولانا رومی کے اس معروف شعر میں جو ایک تلمیحی شعر ہے جس میں نجد و یاران نجد استعارتاً مجنون (قیس بن ملوح) عاشق لیلیٰ اور اسکے دیوانہ وار عشق کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ عشق ایک غایت آرزو ہے کسی کو حاصل کر لینے کا شدّت عمل ہے۔ اگر مقصود عالی ہو تو عاشق قربانی دینے کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ وہ تمام قوّتوں کو اس کے حصول کے لئے مرکوز کرتا ہے۔ اس میں ایسی قوّت آجاتی ہے کہ بہ قول رومی:۔

عشق جوشد بحر را مانند دیگ　　عشق ساید کوہ را مانند ریگ
عشق بشگافد فلک را صد شگاف　　عشق لرزاند زمین را از گزاف

عشق ایک ایسا عزم بالجزم ہے اور کام کرنے کی بے پناہ تڑپ ہے کہ وہ زندگی کے گونا گوں اعمال میں ایک حرکت و تغیر پیدا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اگر مطمح نظر باری تعالیٰ، نگاہ نبی پاکؐ یا مرشد پاک ہو تو انسان تمام دیگر علایق سے کٹ کر اس کی طرف مایل ہوجاتا ہے۔ اور تمام نفسانی خواہشات اور اخلاق ذمیمہ ہوس، حسد، کینہ، نخوب، بغض سے پاک ہوجاتا ہے۔ گویا یہ عشق صادق کی برکت اور اسکا ثمرہ ہے۔

مہجور صاحب نے بھی اسی غرض و غایت اور مقصود کے حصول کے لئے مولانا کا یہ شعر مثنوی کے آخر میں نقل کیا ہے۔ مولوی کے اس شعر کو گیارہویں صدی ہجری کے ایک مشہور ایرانی عالم و شاعر شیخ بہایی (متوفّی

۱۰۳۱ھ۔ق)[1] نے اپنی معروف مثنوی ''نان وحلوا'' میں اس طرح تضمین کے طور پر استعمال کیا ہے:۔

مرحبا، ای پیک فرخ مال ما — مرحبا، ای مایۂ اقبال ما
مرحبا، ای عندلیب خوش نوا — فارغم کردی، ز قید ماسوا
ای نواهایِ تو نار مصده — زد به هر بندم هزار آتشکده
مرحبا، ای بلبل دستان حی — کآمدی از جانب بستان حی
باز گو از نجد و از یاران نجد — تا در و دیوار را آری به وجد
باز گواز ''زمزم'' و ''خیف'' و ''منا'' — وارهان دل غم و جان از عنا
باز گو از مسکن و مأوای ما — باز گو از یارِ بی پروای ما[2]



---

[1] شیخ بهائی کے احوال و آثار کی اطلاع کے لئے رجوع کیجئے۔ ''تاریخ ادبیات در ایران'' از ذبیح اللہ صفا؛ جلد۵ ب۲، ص۱۰۳۹

[2] مثنوی ''نان وحلوا'' کے تمہیدی اشعار سے انتخاب ہے۔

منشور بانہالی

حیات رحیمؒ: نادر ونایاب تصنیف

حیات رحیم ، شاعر کشمیر پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ کا تحریر کردہ ایک نادر تذکرہ ہے جو آپ نے پرگنہ لار سے تعلق رکھنے والے ایک صوفی بزرگ اور ولیٔ خدا حضرت شاہ عبدالرحیمؒ قلندر صفاپوری کے روحانی کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی خدمات اور کمالات کو متعارف کرانے کے حوالے سے تحریر کیا ہے اور موصوف نے شاہ صاحب کے ساتھ اپنی والہانہ عقیدت اور محبت کا اظہار کیا ہے۔ جس کا اظہار کتاب کی پیشانی پر تحریر اس عبارت سے ہوتا ہے جس میں آپ نے ولیٔ خدا مذکور کو "سلطان الفقراء اور باشاہِ بحروبر" جیسے القابات سے مخاطب کیا ہے اور خود کو "یکے از غُلامانِ آنحضور ابوالامین پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ محرّر، محکمہ بندوبس بارہمولہ کشمیر" کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ بقول مُصنف آپ نے یہ تذکرہ ۱۸۔ ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں قلمبند کیا ہوا تھا، جسکی اشاعت میں بوجہ کچھ نامساعد حالات تاخیر

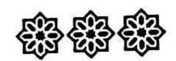
ہوئی اور بعد از ان آپ کے ایک بے لوث کرم فرما اور نامور صحافی مورخ اور محقق محمد دین فوقؔ نے اس پر نظر ثانی فرما کر اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام کیا جس کا مُصنف نے موصوف کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے۔ مصنف نے اپنے ایک خاص دوست، خواجہ غلام احمد عشائی کا بھی شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب میں اپنا اشتراک وقف رکھا ہے۔ کتاب ہٰذا کو مصنف نے اپنے ایک خاص مربی اور حضرت شاہؒ کے خلیفہ حضرت پیر غیاث الدّین شاہ صاحب کی شان ادب میں نذر کیا ہے۔

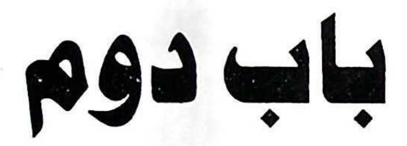
آغاز کتاب ہی مُصنف نے ایک جاذب فکر تمہید قلمبند کر کے کشمیر کی اس وادیٔ جنت نظیر کے علمی، ثقافتی، روحانی اور تہذیبی پس منظر کو اپنے منفرد انداز میں اسطرح سے پیش کیا ہے، گویا سمندر کو کوزے میں سمیٹ لیا ہے جو کئی کتب پر محیط ہے۔ آپ نے سرزمین کشمیر سے متعلق کئی جیّد علماء، صوفیا اور مشاہیر کا ایران کے نامور مشاہیر کے ساتھ موازنہ کرنے کے حوالے سے چند اشارے بھی پیش کئے ہیں۔ کشمیر کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے آپ اس بات کا عندیہ دیتے ہیں، کہ کشمیر کی روح پرور آب و ہوا کے علاوہ یہاں کے لوگوں کی رواداری اور قدر شناسی کا جذبہ بھی، پوری دنیا سے اہل فکر و دانش کو اپنی طرف راغب کرنے کیلئے آمادہ کرتا رہا ہے، اور اُن کی قدر دانی کا حق ادا کرتا رہا ہے۔ آپ کے خیال میں کشمیر کی روحانی اور تہذیبی عظمت کو پروان چڑھانے میں، صوفیائے عظام اور علمائے سلف کی بے لوث محنت و ریاض کا ہاتھ رہا ہے اور اب اس جذبے میں بتدریج کمی واقع ہوتی

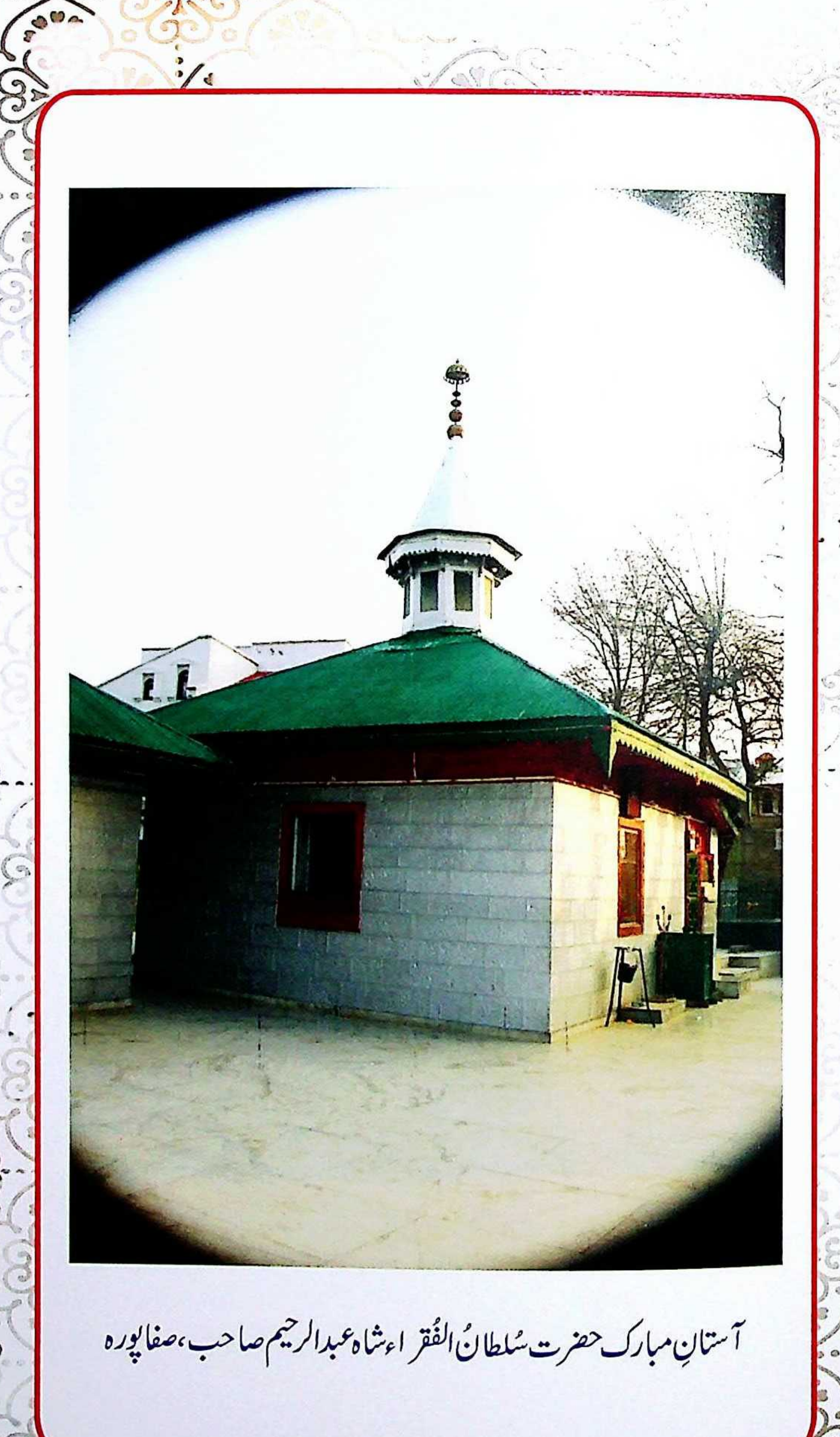
جارہی ہے۔ آپ کشمیر کی موجودہ زبُوں حالی کے لئے خود یہاں کے عصر حاضر کے علماء اور مبلغین کی سست کوشی کو ہی نہیں ذمہ دار ٹھہراتے بلکہ موجودہ پیر مریدی کے سلسلہ کو بھی حدف تنقید بناتے ہیں۔ آپ کے خیال میں پیر مریدی کا موجودہ سلسلہ یعنی نمبرداروں اور چوکیداروں کا اب ایک موروثی قسم کی جاگیر سا بن گیا ہے۔ بلکہ علمی اور عملی صلاحیتوں کے صرف نظر کرتے ہوئے، ناخواندہ عوام کو آسان طریقے سے استحصال کرنے کا مُوجب بن گیا ہے۔ آپ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ کشمیر کے تقریباً ہر پرگنہ اور قریہ میں ایسے صاحب دل بزرگ گزرے ہیں جو بقول اقبالؔ: 'ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں' نظر آتے ہیں۔

لیکن عوام لناس کی لاعلمی کی وجہ سے اس طرح کے اکثر بزرگ گوشہ گمنامی میں رہ کر نظر آتے ہیں اور کسی نے بھی اُن پر قلم اُٹھانے کی سعی نہیں کی ہے۔ زیر مطالعہ کتاب ''حیات رحیم'' میں درج حضرت رحیم شاہ صاحب بھی اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کرامت صوفی بزرگ رہے ہیں۔ جنہوں نے اصلاح اور عوامی خدمت کا بے لوث فریضہ انجام دیا ہے۔ اور آپ کے عقیدت مندوں کا ایک وسیع حلقہ رہا ہے۔ مُصنف نے کافی محنت شاقہ اور تحقیق و جستجو کے بعد یہ تذکرہ قلمبند فرمایا ہے۔ آپ نے جہاں اس ولی نیک مرتبت کے اوصاف واحوال کو بیان کیا ہے۔ وہیں تاریخ کے اُن مختلف ناخوشگوار ادوار کا بھی نقشہ سامنے لایا ہے۔ جن سے یہاں کے عوام کو سابقہ رہا ہے۔ جس کے سبب یہ قوم ظلم و جبر کا شکار رہی ہے اور اب تک بھی

سنبھلنے سے قاصر ہے آپ نے ولیِ کامل مَوصُوف کے روحانی اوصاف اور کمالات کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے جس کا اندازہ خود قارئین کرام کو اس کتاب کے مطالعہ کے دوران ہوگا۔ اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ مصنف کو اسی طرح کے اور بھی کئی دیگر بزرگوں کی سوانح حیات قلمبند کرنے کا ارادہ پیش نظر رہا ہے۔ جو تحقیق طلب ہے۔ لیکن سر دست یہ کتاب جہاں آپ کو ایک نیک دل ولی خُدا کے روحانی کمالات سے متعارف کراتی ہے، وہیں یہ ایک بلند قامت صاحب قلم کا ایک یادگار ادبی کارنامہ بھی ہے۔ جو آپ کی بزرگان سلف سے عقیدت کا عندیہ دیتا ہے اور مطالعہ سے تعلق رکھتا ہے۔



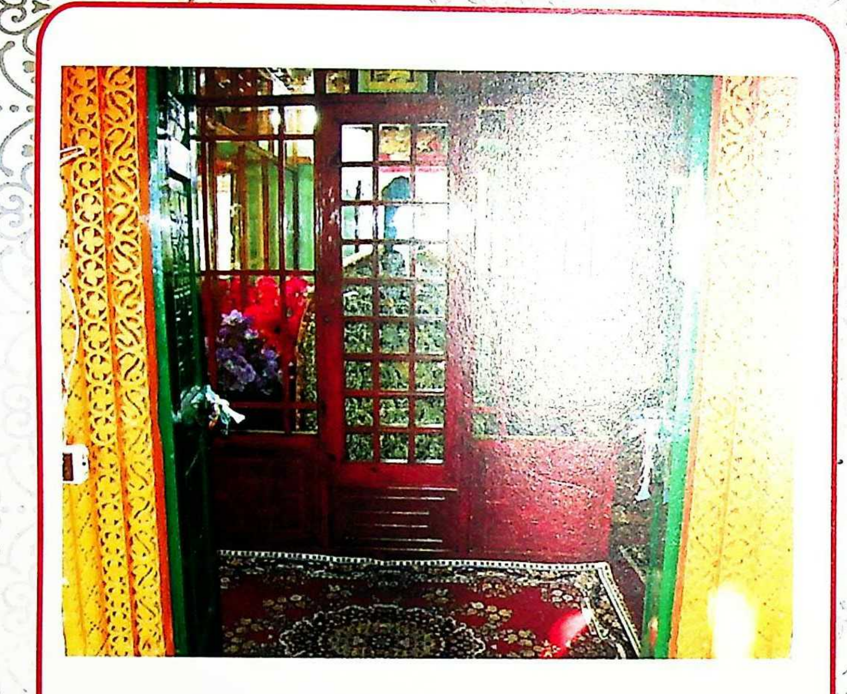

باب دوم



آستانِ مبارک حضرت سُلطانُ الفُقر اءشاہ عبدالرحیم صاحب،صفاپورہ



مزارِ پُر انوار حضرت رحمہ شاہ صاحبؒ قلندر، باغِ جروگہ، صفاپورہ



ضریح ومرقدِ پُرانوار جناب حضرتِ سُلطانُ الفُقراءشاہ عبدالرحیم صاحب، صفاپورہ



پیرزادہ غلام احمد مہجور

دیباچہ

یہ کتاب ۱۳۴۸ھ کے موسم بہار میں لکھی گئی تھی لیکن اب تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی، اس تاخیر کے اسباب تو بہت ہیں مگر سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ حضرت اقدس کے بعض خاص مخلصین و معتقدین اسکو اپنے سرمایہ سے شائع کرانا چاہتے تھے۔ ہنوز اُن کے ارادے عالم خیال ہی میں تھے اور کتاب کی تمہید و ترتیب پر بھی کسی قدر وقت صرف کرنے کی ضرورت باقی تھی کہ راقم کی تبدیلی تحصیل بارہمولہ میں ہوگئی، کام کی کثرت، خیالات کی پریشانی، بندوبست کا محکمہ ان وجوہات نے اشاعتِ کتاب کا سوال دو سال تک معرضِ التوا میں ڈال دیا، لیکن کوئی وقت اور کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ مجھے اسکے جلدتر چھپوانے کا خیال دامن گیر نہ رہا ہو۔ اسی اثناء میں میرے برادر عزیز پیر نوارالدّین شاہ صاحب نے اس کتاب کو ذاتی لاگت سے اپنی ذمہ داری پر شائع کرانے کا مصمم ارادہ ظاہر کیا۔ برادر عزیز کے اس ارادہ نے میری مردہ اور باسی تمناؤں میں بھی ایک تازگی پیدا کردی۔ میں نے بڑی

جدو جہد سے چند یوم کی رخصت لی، سرینگر آیا، شب و روز محنت کر کے کتاب کے مسودہ کو قابل اشاعت بنا دیا، چنانچہ اب بحسن اہتمام برادر صاحب مذکور کا یہ تحفہ ہدیۂ ناظرین ہوتا ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ تصنیف بہت سی کوتاہیوں اور ادبی نقائص سے سراپا مملو ہے۔ مگر اس کتاب کو بمصداق ؎

گرچہ خوردیم، نسبتے است بزرگ

ایک برگزیدہ اور بلند پایہ انسان سے نسبت ہے۔ امید ہے کہ ناظرین باتمکین اور فضلائے نکتہ بین میری علمی اور ادبی کمزوریوں کو بخیال اُنْظُرْ اِلٰی مَاقَالَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰی مَنْ قَالَ نظرانداز کر کے ان اوراق کو بہ نظر وقعت دیکھ کر شکر گذاری کا موقع دیں گے۔

میں نہایت صدق دل سے کشمیر کے مایہ ناز اور اپنے مکرم دوست خواجہ غلام احمد صاحب عشائی ایم۔اے، بی۔ٹی، ایچ۔بی۔ایم، او۔ایل کا ممنونِ احسان ہوں، جنہوں نے دِلی شوق سے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس کتاب کی صحت و ترتیب میں میری مدد فرمائی ہے۔

میں آخر میں اُس نحیف الجثہ مگر ''بقیمت بہتر'' فدائے ملّت بزرگ ہستی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جس کا نام ''کشمیر جدید'' کی تاریخ میں مورخ آبِ زر سے لکھیں گے۔ جس نے صدہا میل اپنے وطن قدیم ''کشمیر'' سے دور رہ کر اپنے پس ماندہ اہل خطہ بھائیوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور اس

خطۂ زمہریر کے منجمد و ساکن خون کو حرکت و حرارت میں لانے کے لئے "اخبار کشمیری" جاری کیا۔ میری مراد منشی محمد الدین صاحب فوقؔ سے ہے جن کے مشہور نام سے علاوہ پنجاب و ہند کے کشمیر کا ہر لکھا پڑھا انسان واقف اور ان کی خدمات ملّیہ کا معترف ہے۔ آپ نے باوجود عدیم الفرصتی کے "حیات رحیم" کے مسودہ پر نظر ثانی فرمائی اور اس کی طباعت و کتابت کا اہتمام اپنے ذمہ لیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو جزاءِ خیر عطا کرے آمین! ثم آمین۔

پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ

پیرزادہ غلام احمد مہجور

تمہید

روزان وشبان بہ، گر دِ مردان مے گرد　　　　مردے گردے چو گر دِ مردے گردے

خطۂ کشمیر جنّت نظیر کی مختصر وادی کو لوگ طرح طرح کے توصیفی ناموں سے یاد کرتے ہیں کوئی اسے ارم تخمیر کہتا ہے، کوئی جنّت نظیر، کوئی اسے گلزار جناں سے تشبیہ دیتا ہے اور کوئی باغ سلیمان قرار دیتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہونگے جو کشمیر کی پوری اور اصلی تعریف سے آگاہ ہوں۔ اگر کشمیر کی اس عالمگیر شہرت کا انحصار صرف یہاں کی فرحت افزا آب و ہوا اور روح پرور نباتات پر ہی منحصر ہے تو وہ چنداں قابل وقعت نہیں ہے کیونکہ دنیا میں اور بھی کئی ایسے مقامات ہیں جہاں سر سبزی و شادابی کشمیر سے کم نہیں ہے۔ جہاں کا موسمِ خزاں کشمیر ہی کی طرح رشک صد بہار ہے۔ جہاں گل و گلزار اور چشمہ ہائے و آبشار اسی کثرت سے ہیں۔ جس کثرت سے کشمیر میں ہیں۔

ایران کا مشہور لسان الغیب خواجہ حافظ شیرازی انہی خوبیوں کی وجہ سے ''کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلی'' کو تمام جہان کی نعمتوں پر ترجیح دیتا ہے۔ ایران کے مرغزار دلبستگی میں کشمیر سے کم نہیں ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایران جیسے خطۂ گلریز کے فلاسفر، شاعر اور ادیب بھی کشمیر کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

درحقیقت جس وصف نے اس محدود پہاڑی ملک کو ربع مسکون میں مشہور کر دیا ہے۔ وہ ضرور قابل غور ہے۔ مگر اس سے ارباب ظاہر بین نا آشنا ہیں۔ وہ قوی اور اصلی وجہ یہ ہے کہ قدرت نے ابتداءِ آفرینش سے اس ملک کے باشندوں کو خاص روحانی طاقت اور مادہ عطا کیا ہے۔ جسکی نظیر خصوصیت سے اور ملکوں میں بہت کم ملتی ہے۔ اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو صاف پایا جاتا ہے کہ اس ملک کی ابتدائی آبادی رشی، مہارشی اور عابد لوگوں نے ہی کی ہے گو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان روایات میں مبالغہ آمیزی سے ضرور کام لیا گیا ہے لیکن اگر ان کو نظر انداز کر کے اصلیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو یہ نتیجہ ضرور اخذ ہوتا ہے اور ہر پہلو سے ماننا پڑتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے عابد لوگ ہی آباد ہوئے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو نہایت خدا ترس اور دنیا سے غیر مانوس تھے۔ بعد میں جب اس مرغزار نے ایک مُلک کی صورت اختیار کی تو بڑے بڑے مہارشی، دیوتا، فلاسفر، محقق اور شعراء یہاں پیدا ہوئے جن کی ہمہ گیر شہرت نے کشمیر کے مختصر سے ملک کو تمام دنیا میں روشن کر دیا۔ یہ مُلک ایک غیر محدود عرصہ سے زمانۂ دراز تک انہی لوگوں کا

مسکن و ملجا اور خلوَت خانہ رہا، بلکہ ہر سمت کے ہمسایہ لوگوں کا مذہبی مرکز بھی یہی خطہ تھا۔ آخر جب اس مُلک نے اسلام کا نورانی جامہ پہنا تو قانون قدرت کے مطابق یہاں کی قدیم تہذیب میں بھی انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ لیکن روحانیت کسی قوم کی میراث نہیں ہے، بلکہ اسلام کو ہمیشہ اس کا زیادہ دعوی رہا ہے۔ پس اسلامی تہذیب نے اس نورانی کشش و طاقت کو چار چاند لگا دیئے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس وادی نے وہ انسان دنیا کے آگے پیش کئے جن کی نظیر پیر گردوں آج تک کہیں سے نہ دکھا سکا۔ اگر اہل ایران کو خواجہ حافظ کی غیب اللسانی اور شیریں بیانی پر فخر ہے، تو اہل کشامرہ اسکے مقابلہ میں ایک فقیر اور غیر زبان شاعر ملاّ طاہر غنی کی فصیح البیانی اور قادر الکلامی پر بجا ناز کر سکتے ہیں۔ جس کے کلام کا جواب خود ایرانی پیش نہ کر سکے اور جس کی جادو بیانی اس زمانہ کے ملک الشعرائے ایران صائبؔ کو اُس دور و دراز اور مہذب ملک سے کھینچ کر کشمیر کی وادیوں میں صرف اس غرض سے لے آئی کہ ملا طاہر غنی جیسے بے نظیر سخنور کی زیارت کر لی جائے۔ اگر ایرانی فردوسی جیسے ملک الشعراء اور خدائے سخن آفرین پر نازاں ہیں تو یہاں سے ایک معمولی دیہاتی اور گودڑی پوش ایک مسجد کا امام شائقؔ جواب میں پیش ہوتا ہے جس نے تاریخ کشمیر کے مضمون پر اَسی ہزار (۸۰۰۰۰) ابیات تصنیف کر کے اعلیٰ رزمی قابلیت کے جوہر دکھا دیئے۔

مولانا نظامی گنجوی نے ۲۸ ہزار ابیات کا خمسہ لکھا تو یہاں شیخ صرفیؔ ملاّ بہاؤ الدّینؔ، ملاّ اشرف دیریؔ اور ملاّ حمیدؔ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنا اپنا

خمسہ نظامی کے جواب میں پیش کر کے رزم و بزم کی نئی نئی رنگینیاں دکھا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

حضرت مولانا جلال الدّینؒ رومی مصنف مثنوی شریف نے تصوّف کا دریا بہا کر اسلامی دنیا میں ہل چل مچادی۔ کشمیر کے ایک عارف باللہ حضرت مرزا اکمل الدّین بیگ خان کاملؒ نے اَسی ہزار (۸۰۰۰۰) ابیات کی ضخیم کتاب تصوّف میں لکھی جس کا جواب روئے زمین پر نہیں۔

ایشیا کو اگر ابن بطوطہ کی سیاحی پر ناز ہے تو اہل کشمیر صرفیؒ کی عالمگیری پر فخر کر سکتے ہیں۔ یہ تو صرف شعرائے بلند خیال کا ذکر ہے۔

اب ذرا علماء کی طرف نگاہ کیجئے۔ جناب حضرت بابا داوٗد خاکیؒ نے فقہ کی تحقیق وتدقیق میں وہ کمال دکھایا کہ لوگ انہیں امام الاعظمؒ ثانی سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت جامع الکمالات صوری و معنوی شیخ یعقوب صرفیؒ نے تفسیر کبیر کے مقابلہ پر عربی تفسیر لکھی بلکہ اس کی اہمیت بڑھانے کے لئے اسلامی دنیا کی سیاحت کی۔ علامہ کمال الدّین کاشمیریؒ جو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی حضرت مجدّد الف ثانی اور نواب سعد اللہ خان وزیر شاہ جہان کے اُستاد تھے۔ کشمیر ہی کی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے۔ زمانۂ مغلیہ کے آخری صدر الصدور مولانا صدر الدّین آزردہ جن کے شاگردوں میں سر سید احمد مرحوم بانی علی گڈھ کالج کا نام سب سے زیادہ روشن ہے کشمیری الاصل ہی تھے۔ ان کے علمی کمالات سے تمام ہندوستان آگاہ ہے۔

صوفیانہ مذاق میں بھی یہ خطۂ دنیا کے تمام اسلامی ملکوں سے برتر رہا

یہاں کی خاک کیمیا اثر سے وہ الوالعزم صوفیائے کبار اور اولیائے نامدار پیدا ہوئے جن کی نورانی جھلک سے ایک دنیا منوّر ہوئی اور جنہوں نے فیوض باطن کے وہ دریا بہائے کہ مشرق و مغرب کو سرسبز کر دیا۔ سرحلقہ ریشیان کشمیر جناب حضرت شیخ نورالدّین نورانیؒ محبوب العالم جناب حضرت شیخ حمزہ مخدومیؒ آج تک علمدار ملک کشمیر اور سلطان العارفین کے مبارک ناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اسلامی دنیا کی تاریخیں ان کے کمالات سے پُر اور دوست و دشمن ان کے روحانی فیضان کے قائل ہیں۔ یہ تو حضرات عالی درجات کا ذکر ہے۔

کشمیر میں کوئی محلّہ یا گاؤں ایسا نہیں ہے۔ جہاں کسی نہ کسی ولی اکمل اور صوفی اجل کا مزار نہ ہو۔ اگر ان کے باطنی کمال اور روحانی جلال کا وزن کیا جائے تو انہی معمولی ٹوٹے پھوٹے مقبروں کے سونے والے جنیدؒ و بایزیدؒ کے ہم پلہ ثابت ہونگے۔

صوفیانہ تجلی نے خطۂ کشمیر کی زمین میں وہ مقناطیسی طاقت پیدا کی تھی کہ دیگر ممالک کے بڑے بڑے ولی اور قطب وقت اپنے عزیز وطن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہکر یہاں چلے آتے تھے۔ اور بقیہ زندگی کے ایاّم اسی گوشۂ تنہائی میں بسر کرتے تھے۔ چنانچہ جب امیر تیمور گورگانی نے کسی خاص رنجیدگی سے گروہ سعادات پر جبر و تشدّد کا ہاتھ دراز کیا تو ترکستان کے اکثر عالی پایہ سعادات اُسکی تیغ خون آشام سے نجات حاصل کرکے ہزاروں کی تعداد میں کشمیر چلے آئے۔ اُس وقت ان کو روئے زمین پر ایسا پُر امن غار حرا

اور کہیں نظر نہ آیا۔ انہوں نے دیگر ملکوں کے آباد اور بارونق شہروں پر اسی مختصر سی پہاڑی وادی کو ترجیح دی۔ انہی لوگوں میں ''علی ثانی'' ہوئے۔ اور انہیں بزرگوں کے دم قدم سے یہ ناچیز وادی ''مدینۂ ثانی'' کہلانے لگی۔ اس وقت تخت کشمیر پر سلاطین کشمیر جلوہ افروز تھے۔ وہ بھی اسی رنگ سے رنگین ہوئے۔ سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہؒ (بادشاہ کشمیر) کے صاحب دل ہونے میں کس کو انکار ہے۔ ان کی خدا طلبی و خدا ترسی راستبازی اور عدل پروری سے عام لوگوں کے اخلاق بھی قابل تحسین ہو گئے تھے۔ اور اسلام اپنے اصلی نورانی چہرہ میں نظر آتا تھا۔

صنعت وحرفت میں بھی روز افزون ترقّی تھی۔ فن سپہ گری اور شمشیر زنی میں بڑے بڑے رستم وسام اور گردان زابلستان ان کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ جیسا کہ فتوحات سلاطین کشمیر سے ظاہر ہے آخر جب بعض لوگوں کی خود غرضی سے تخت کشمیر، کشمیری تاجداروں سے خالی ہوا اور لوگوں میں عیش وعشرت کے خیالات پیدا ہو گئے تو رفتہ رفتہ روحانیت بھی زوال پذیر ہوئی۔ اہل باطن اور روحانی حکیم روز بروز عنقا نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ اختتام حکومت اسلامیہ کے ساتھ ہی ان کا بھی خاتمہ ہو گیا تاہم گذشتہ صدی ہجری میں کہیں نہ کہیں ملک میں کوئی نہ کوئی نظیر نظر آجاتی تھی۔ مگر اب تو نقش قدم کے نشان بھی نظر نہیں آتے۔

دل برباد میں اڑتی ہے اب خاک
یہ بستی غیرتِ جنت کبھی تھی

اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ اب ملک ویسے صاحب کمالات سے بالکل خالی ہے اور وہ روحانی فیض آئندہ کے واسطے بند ہو چکا ہے۔ نہیں بلکہ ایسے نیک لوگ ملک میں اب بھی موجود ہیں۔ مگر بہت کم، جو ہم کوتاہ بینوں کو نظر بھی نہیں آسکتے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مُلک میں اب یہ مذاق کم ہوتا چلا جاتا ہے اور اخلاقی وبا پھیل گئی ہے، تو اس ظلمات میں آبِ حیات کی طرح پوشیدہ اور مخفی رہے اور لعل بدخشاں کی طرح عام سنگریزوں میں چھپے رہے۔ اب اگر لاکھوں میں سے کوئی انسان قوتِ فطرت کی مشعل ہاتھ میں لیکر ان کی تلاش میں صحرا نورد ہو جاتا ہے، تو ہر ایک جانب سے اسے یہی آوازیں کانوں میں آتی ہیں۔

اے کہ ہمراہ موافق بہ جہان مے طلبی
این قدر باش کہ عنقا ز سفر باز آید

یہی نیک خلقت اور یہی کامل انسان جن کا اوپر ذکر ہوا، کشمیر کی حقیقی شہرت و نیک نامی کا باعث تھے۔ جن کے اخلاق حسنہ اور کارنامہ ہائے مافوق الفطرت نے اس چھوٹی سی وادی کو چار دانگ عالم میں مشہور کر دیا۔ چنانچہ اس زمانہ کے محقق بھی اہل کشامرہ کے انہی اوصاف حمیدہ کے مداح تھے۔ ایران کا مشہور نازک خیال شاعر ظہوری ترکوں کے حسن جہانسوز کے مقابلہ میں کشمیریوں کی ملاحت وشیرین بیانی کی سوگند کھاتا ہے۔

بہ تُرکانِ غارت گرِ صبر و ہوش
بہ کشمیریانِ ملاحت فروش

اب اگر کشمیر مشہور ہے تو اپنے فانی تاثرات و جذبات کی وجہ سے کوئی آب و ہوا کی تعریف کرتا ہے، کوئی اچھابل اور چشمہ ویری ناگ کی تعریف میں مست ہے، کوئی گلمرگ کی گلریزیوں پر فدا ہے۔ غرض روحانیت کا مزاق نہیں رہا۔ ظاہر پسندیوں نے باطنی اوصاف زائل کر دیئے۔ کیونکہ دنیا میں اب روحانیت کا مذاق نہیں رہا۔ موجودہ خلقت ظاہر پسند ہے۔

اب یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ کیوں روحانیت کا مذاق کشمیر میں کم ہوتا گیا اور کیوں وہ روحانی حکیم نظروں سے پوشیدہ ہو گئے، جن کی صحبتوں سے غیر مما لک کے لوگ فیض یاب ہوتے تھے۔ اس کا جواب بالکل آسان ہے۔ قدرت کے اٹل قانون سے کوئی چیز دنیا میں محفوظ نہیں رہ سکتی۔ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی فن میں کمال پیدا کر لیتی ہے تو اس وقت ان میں آرام طلبی اور تعیش کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ ترکوں کی بہادری کا کس کو اعتراف نہ تھا۔ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی بے نظیر جنگی طاقت کا لوہا مان چکی تھیں۔ ترکون کو بھی جب یہ محسوس ہوا کہ اب ان کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تو انہوں نے آرام طلبی شروع کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہمسایہ طاقتوں نے (جو عرصہ سے ان کی تاک میں تھیں) دیکھا کہ اب ان میں وہ جوہر نہیں رہا تو انہوں نے یورش کر کے صدیوں کی سلطنت کو چشم زدن میں درہم برہم

کر دیا وہ بھی خواب غفلت سے تب بیدار ہوئے جبکہ سیلاب نے ان کا گھر بار بہا دیا تھا۔ اسی طرح جب اہل کشامرہ نے روحانی طاقت سے ہر ایک فن میں کمال دکھا دیا تو ان میں رعونت پیدا ہوئی۔ اور تعیش پسندی نے آ گھیرا۔ رفتہ رفتہ وہ سب جو ہر جن سے ان کی عزّت و توقیر تھی، سلب ہوتے گئے۔ سب سے پہلے حکومت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ حکومت نہ رہی تو کچھ بھی نہ رہا۔ غیر اقوام اور غیر ملکی لوگوں کی نظروں میں حقیر سمجھے جانے لگے۔ تعلیم و تربیت سے بے بہرہ ہو گئے۔ وہ اصلی جوہر یعنی روحانی طاقت جس پر اس قوم کو زیادہ ناز تھا اور جو صدیوں سے اس ملک کے باشندوں کے مذاق میں پورا دسترس رکھتا تھا یک بیک کافور ہو گیا۔ اس کی معدومی نے اخلاق پر نہایت بُرا اثر ڈالا۔ لوگوں میں جھوٹ، فریب، دغا بازی، مکاری، خود غرضی، خودنمائی، پست حوصلگی اور بزدلی حد سے زیادہ پیدا ہوگئی۔

یہ ایک قدیمی قاعدہ ہے کہ جب کوئی اچھی چیز کہیں سے رخصت ہو جائے، مر مٹنے پر بھی کچھ نہ کچھ اس کی یادگار رہ جاتی ہے۔ مگر ایسی یادگار اکثر ضدی پہلو لئے ہوئے ہوتی ہے۔ اس قاعدہ کے مطابق اہل تصّوف اور روحانی مصلحوں کی رخصت پر ان کی ضدی یادگار اس طرح قائم رہی کہ آج کل کشمیر میں ایک کثیر التعداد فرقہ یعنی پیر صاحبان (جن کی تعداد بروئے مردم شماری ۶۱۶۵ ہے) حضرات صوفیا کے جانشین اور صاحب دل ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اور وہ لقبِ پیر جو اہل تصوف کو سالہا سال کی محنت و جانگدازی اور ریاضات و مجاہدات سے حاصل ہوتا تھا انہوں نے عام

ذاتوں کی طرح اختیار کرلیا ہے۔ یہاں تک کہ دیگر ذاتوں اور گوتوں میں یہ بھی ایک ذات شمار ہوتی ہے۔ ان مدعیان معرفت نے کشمیر کی خلقت کو کم وبیش آپس میں تقسیم کردیا ہے۔ ان کو اپنی اصطلاح میں مرید کہتے ہیں۔ سال کے بعد ہرایک پیر اپنے مرید کے گھر جا کر اس سے حسب استطاعت سالانہ ٹیکس (نیاز) وصول کرتا ہے۔ اسی ٹیکس پر اس خلقت کا گذارہ ہے۔ اور صرف یہی ان کا ذریعۂ معاش ہے۔

ایک پیر کے ہاں جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو اکثر اسے فارسی زبان کے دو چار رسالے اور کشمیری زبان کے چند ٹوٹکے پڑھائے جاتے ہیں اور رائج الوقت تعویذ نویسی کا کام سکھایا جاتا ہے۔ یہی پیر ہونے کی اعلیٰ سند ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر یہی خلعت ارشاد ہے۔ یہ منزل طے کرکے ہر ایک پیر زادہ مریدوں سے بعیت لینے اور اپنے آپ کو مذہبی رہنما تسلیم کرانے کا مجاز ہے چاہے اس کے اپنے اخلاق کیسے ہی مذموم کیوں نہ ہوں۔ گویا یہ رتبہ نمبردار دیہہ کی وفات پر اس کا بڑا لڑکا نمبردار قرار دیا جاتا ہے، باقی اس عہدہ سے محروم رہتے ہیں۔ یا اگر نمبردار لاولد یا بلا اولا دنرینہ فوت ہوجائے تو اسکی حقیت نمبرداری خاندان کے قریبی رشتہ داروں یا یک جدیوں میں سے کسی کو دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں پیری مریدی کا رتبہ اس پر بھی سبقت لے جاچکا ہے۔ پیر صاحب کی وفات پر اس کے مرید بحصہ مسادی نہ صرف اولا دنرینہ میں ہی تقسیم ہوتے ہیں بلکہ لڑکیاں بھی محروم نہیں رہتیں۔ بعد میں وہ لڑکیاں بذریعہ شوہران خود گرداوریٔ مُریدان کا کام اپنے ہاتھ میں لیتی ہیں۔ اور

لطف یہ ہے کہ اس خرید وفروخت اور اس تقسیم جائداد منقولہ وغیر منقولہ یعنی مریدوں کی قطع وبرید کی خبر خود مریدوں کو نہیں ہوتی۔

فلک نے لوٹ کے لٹوا دیا حسینوں سے
سمجھ لیا کسی مُردے کا اس نے مال مجھے

یہ پیر صاحبان خاص طور پر پوشش، صفائی، خوراک اور سواری اچھی رکھتے ہیں ان میں پیر کامل اور شیخ الشیوخ وہی تصور ہوتا ہے جس کے زیر سواری زیادہ خوبصورت اور قیمتی گھوڑا ہو، جس کا لباس عام پیروں سے فوق البھڑک ہو اور مالی طاقت بھی اوروں سے اچھی رکھتا ہو۔

چونکہ یہ پیر صاحبان کسی مرید کی دستگیری روحانی طاقت سے نہیں کرسکتے، اسلئے انہوں نے بھی ظاہری وسائل سے مدد لینی شروع کی ہے۔ اکثر پیروں نے بعض ادنیٰ اہلکاران سرکاری کے ساتھ تعلقات دوستانہ پیدا کر لئے ہیں۔ جب ان کا کوئی مرید کسی دنیاوی صدمہ میں مبتلا ہو کر کسی عدالت یا محکمہ میں ماخوذ ہوتا ہے تو پیر صاحب اپنے دوست کے ذریعہ اپنے مرید کی مدد فرماتے ہیں۔ حسب منشاء کامیاب ہونے پر اس دلالی کی فیس ڈبل چارج کرتے ہیں۔ جس کا اصطلاحی نام نیاز رکھا گیا ہے۔ مناسب کمیشن ملنے پر لوگوں کے باہم گر رشتہ و ناطہ کے تعلقات بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ ظاہری طور پر انگریزی تعلیم اور جدید تہذیب کے دشمن ہیں۔ رات دن نئے فیشن کے لباس اور طرز وطریق پر نفرت کا وعظ فرماتے رہتے ہیں۔ بلکہ

ایسے شخص کو جس نے انگریزی تعلیم پائی ہو اور جدید روشنی سے کچھ مفاد اٹھا رہا ہو یا اٹھانا چاہتا ہو کافر مطلق اور یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن جب غرض ہوتی ہے تو انہی لوگوں کے دروازوں پر جا کر جبہ فرسائی اور آستان بوسی کرتے ہیں۔ پھر اگر ایسے لوگ ذرا خندہ پیشانی اور مہربانی سے پیش آجائیں تو ایسی حرکت کو سعادت دارین خیال کرتے ہیں بقول جناب فوقؔ۔

غرض کے بندے کو جس وقت کام ہوتا ہے
ہزار دشمنی پر بھی سلام ہوتا ہے

فتنہ و فساد کے بغیر ان کا کوئی اور شغل نہیں ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر عدالتوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔ مریدوں کی حصہ کشی پر اکثر خانمان اور ننگ و ناموس برباد کر دیتے ہیں۔ برسوں کے تنازعات کے بعد بنائے خصومت یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرے بڑے بھائی نے فلان نمبردار۔ یا ذیلدار یا اور کوئی متمول شخص اپنا مرید بنالیا ہے۔ حالانکہ وہ بروئے تقسیم میرے حصہ میں آچکا ہے۔ غرض کہاں تک ان ''بدنام کنندہ نکونامے چند'' لوگوں کے اخلاق و عادات کا تذکرہ کروں۔ حقیقتاً یہی ناخلف انسان مسلمانانِ کشمیر کی اخلاقی عمارت کے بیخ کن ہیں۔ وہی کشمیری جس کے اوصاف میں نازک خیالاتِ عالم نے دفتروں کے دفتر پُر کئے تھے۔ ان ناعاقبت اندیش اور کور باطن لوگوں کی مہربانی سے آج جہنم نظیر نظر آتی ہے۔

انہوں نے دریوزہ گری سے ملک کو سقیم الحال کر دیا ہے۔ اگر یہ فرقہ ملک سے خارج کر دیا جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ملک کو کوئی تکلیف ہوگی۔

معلوم نہیں ہوتا کہ اس بدعت اور رسم بد کی بنیاد کس طرح قائم ہوئی ہے۔ اور ان لوگوں نے یہ مسئلہ کس کتاب سے حل کرایا ہے کہ ہر ایک پیر کا ہر ایک لڑکا پیدا ہوتے ہی ہر صورت میں پیر سمجھا جانا چاہیئے۔ حالانکہ اسلام کے زرّین اصول اس کے برخلاف ہیں۔ اور تیرہ سو سال (۱۳۰۰) کے اندر ایسی کوئی مثال قائم نہیں ہوئی۔ بلکہ خود شارع اسلام حضور کائناتؐ نے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں فرمایا۔ چنانچہ بعد میں اس پر بہت کچھ بحث و مباحثات ہوئے جن سے اسلامی تاریخ کے اوراق لبریز ہیں۔ گو مخبر صادقؐ کی نگاہ انجام بین سے یہ پوشیدہ نہ تھا کہ اس ایک مسئلہ کو حل طلب چھوڑنے سے اسلام میں کس قدر دقتیں پیش آئینگی لیکن انہوں نے اس مقدّمہ کو آسمانی ہائیکورٹ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا۔ اور اکثر یاروں کے استفسار پر زبان معرفت بیان سے یہی ارشاد ہوا۔ کہ ''میرے بعد اسی کو اپنا امیر اور میرا جانشین سمجھو۔ جس کی تائید روح القدس کرے'' آخر ایسا ہی ہوا۔ اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ اگر روحانی امارت اور باطنی سرفرازی موروثی ہوتی تو اصحاب رسول اللہؐ ہرگز برادر و داماد حضرت رسالت مآبؐ دروازۂ شہر علم، شیرِ خُدا، ابوتراب فاتح خیبر پر کسی دوسرے صحابی کو ترجیح نہ دیتے۔ یہی نظیر معشر اسلام کے لئے کافی تھی۔ جس کو کشمیر کے پیر صاحبان نے نظر انداز کر دیا ہے۔

اب لفظ پیر کو ملاحظہ فرمایئے۔ یہ بھی خاص نوعیت سے خالی نہیں

ہے۔ حضرات صوفیاء نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ''قطب را دان نیم پیر و غوث را پیر تمام''۔ اہل تصوّف میں یہ بہت بڑے دو عہدے ہیں۔ ایسے عہدہ دار کی شان دیکھنا اگر مطلوب ہو تو قطب ربانی، غوث صمدانی، محبوب یزدانی جناب حضرت شیخ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کا اسم گرامی کافی ہے اور ان کی سوانح زندگی ملاحظہ کی جائے۔ بعد میں آپ ہی انصاف کریں کہ کشمیر کے پیر صاحبان آسمانی بادشاہت کے ان عالی پایہ عہدوں میں سے کونسا عہدہ رکھتے ہیں۔ دنیا کے ان ناپاک وحریص کپڑوں میں ان الوالعزم شاہ سواروں کی کونسی نشانی ہے۔

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک
کجا عیسیٰؑ کجا دجّالِ ناپاک

کشمیر کے پیر صاحبان پیشوائے ملّت اور رہنمائے قوم ہونے کا دعوی رکھتے ہیں (اور گو بعض حضرات کا یہ دعویٰ اب بھی صداقت پر مبنی ہے) لیکن عام پیر صاحبان کے متذکرہ صدر اخلاق کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے ایک منصف مزاج انسان اندازہ لگا سکتا ہے کہ قوم پر ان کا کیسا اثر پڑتا ہوگا۔ اور ایسے پیروں کے مرید کیسے ہونگے۔

گر ہمین مکتب و ہمین مُلّا　　کارِ طفلان تمام خواہد شد

یہ مسلمہ بات ہے کہ موجودہ عہد میں مسلمانان کشامرہ کی اخلاقی حالت نہایت تباہ ہے۔ دنیا بھر کی برائیاں ان لوگوں میں جمع ہیں۔ اسلام

میں مادہ ہمدردی و ایثار وراثتاً چلا آتا تھا اور یہاں کی معتدل آب و ہوا نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مگر اب اس کا نام و نشان بھی نہیں۔ ان برائیوں اور بداخلاقیوں کا جو نتیجہ اس قوم کو ملا، وہ اِفلاس و فلاکت اور سقیم الحالی ہے۔ جس نے ان کا کچومر نکال دیا ہے اور جس نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا۔ مگر افسوس ہے کہ اس درجہ پر پہنچ کر بھی یہ لوگ شرارتوں سے باز نہیں آتے۔ عدالتوں میں یہ لوگ خوار و ذلیل ہوتے ہیں۔ جیل ان سے آباد ہے۔ شفاخانے ان سے پُر ہیں۔ پولیس کا رجسٹر نمبر ۱۰/ ان کے وجود پر قائم ہے۔ رذیل سے رذیل کام ان کے ہاتھوں سے ہوتے ہیں۔ کئی سرکاری عہدہ دار اہلکاران پولیس، وکیل اور ساہوکار غرض تمام ہوشیار لوگ ان کی جہالت کی بدولت اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ بنگلے، کوٹھیاں، دلکش باغیچے اور نفیس بگیاں انہیں کے خون سے بنائی ہیں۔ اوروں کے لئے یہ قوم نخل پُرثمر ہے مگر اپنا میوہ ان پر حرام ہے۔ خود بھوکے مرتے ہیں اور ذلیل ہوتے ہیں۔ حد سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ اس درجہ پر پہنچ کر بھی یہ لوگ لچر عادات، عیاشی، فضول خرچی اور اِسراف سے باز نہیں آتے بلکہ عیوب کی بیماری اس قوم میں لفظ بہ لفظ ترقّی پذیر ہے۔

ایسے نازک وقت پر ایسی علیل الاخلاق قوم کو کسی روحانی ڈاکٹر کی ضرورت تھی جو ان کی اس بیماری کو دور کرتا۔ چونکہ یہ زہریلہ مادہ ہر ایک فرد بشر کے رگ و ریشہ میں تقویت پذیر ہو چکا ہے۔ اس لئے ڈاکٹر بھی وہ ہونا چاہئے جس کی تائید آسمان کرے اور وہ علاج قوم پر اپنا جان و مال، جاہ و

جلال اور دین وایمان قربان کرے۔ جیسا کہ ایسے موقعہ پر ہندوستان کے اخلاقی بیماروں کو خدائی سلطنت کی طرف سے ایک طبیب حاذق اور روشن دماغ ڈاکٹر آنریبل سر سید احمد خان صاحب بہادر مرحوم غفر اللہ لہٗ عطا ہوا تھا۔ جس نے ہندوستان میں پھر کر ان مایوس العلاج بیماروں کی دایمی آسائش اور بقائے زندگی کے لئے ہر قسم کی سختی برداشت کی۔ خواب وآرام کو ترک کیا۔ لذات دنیا سے بیزار ہوا۔ بحالت کہن سالی وہ تکلیفیں خوشی سے گوارا کیں جن کا برداشت کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ باوجود امیر الاسرار اور اعلیٰ خاندانی ہونے کے ایک جاہل اور ذلیل قوم کی بہتری کے لئے بازاروں میں، انجمنوں میں، جلسوں میں اور عام شاہراہوں پر عاجزانہ لہجہ سے۔ ؎

قومِ من اے قومِ من از بہرِ تُو
دادہ ام بر باد ننگ و نام را

کا ترانہ گاتا رہا۔ اس تگ وتاز اور جانکاہی سے اس قومی گدا نے ہمت کے کشکول میں جو کچھ فراہم کیا اس سے علی گڈھ میں وسیع پیمانہ پر اخلاقی بیماروں کے لئے ایک دار الشفا کھول دیا۔ پس جو کام اس ہسپتال نے آج تک کیا وہ اظہر من الشّمس ہے۔

ایسے مسیحا صفات ڈاکٹر کی ریس آج تک بہتوں نے کی۔ مگر تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ؎

آن عزیزان را نشانِ دیگر است

تھوڑا ہی زمانہ گذرا کہ مسلمانان کشمیر ہمسایہ قوموں کے طعن و تشنیع سے ذرا متاثر ہو کر جب کسی قدر اپنی کرتوتوں پر شرمانے لگے، تو قوم کے مایہ ناز مشہور ہمدرد خان صاحب میرزا غلام مصطفیٰ صاحب رئیس اعظم کشمیر نے اصلاح قوم کے مضمون پر ایک چھوٹا سا رسالہ موسومی ''دستور العمل'' شائع کرایا اور ملک میں تقسیم کیا گیا۔ چند روز تک تو ضرور اس کا غلغلہ شہر میں رہا مگر افسوس اور حسرت سے یہ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کاغذی ہدایت کا شور وغل طبل تہی کی آواز سے زیادہ سودمند ثابت نہ ہوا۔

غرض مسلمانان کشمیر کی اخلاقی عمارت عرصہ سے متزلزل ہو رہی ہے اور اس قوم کا روحانی سرمایہ تمام وکمال غارت ہو چکا ہے۔ ایسے ظلمت کدے میں، ایسی اندھیر نگری میں، ایسے جاہل ملک میں، ایسے قحط الرجال میں کشمیر کے ایک گم نام گاؤں اور غیر معروف گوشہ میں سلطان الفقرا تاج الاولیاء جناب حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قلندر صفاپوری کشمیریؒ کا ظہور ہونا فی زمانہ نہایت غنیمت اور باعث افتخار ہے جن کی سوانح زندگی پر یہ چند اوراق لکھے جاتے ہیں۔

حضرت سلطان الفقراء، موجودہ زمانہ کے ایک زمیندار بٹ خاندان میں پیدا ہوئے۔ چونکہ میں اس سے پہلے ذکر کر آیا ہوں کہ روحانیت کسی قوم، کسی ملّت، کسی فرقہ، کسی خاندان یا کسی ذات کی میراث

نہیں ہے۔ یہ خدائی نور جہاں سے ظہور کرے، سب کو حیران کر دیتا ہے۔ قانونِ قدرت کا دستور قدیم سے ایسا ہی چلا آیا ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از شام
زخاک مکّہ ابوجہل، این چہ بوالعجبی است

تاہم ان لوگوں کی تسلی کے لئے جو ظاہری وجاہت کے دلدادہ ہیں، اس قدر لکھنا شاید غیر موزون نہ ہوگا کہ سلاطین کشمیر کے عہد میں عرصہ دراز تک کشمیر کی وسیع سلطنت کی مدارالمہامی اور وزارت عظمیٰ کی زمام اسی خاندان (بٹ) کے اسلاف کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ اگر اس غرض کیلئے تاریخ کشمیر کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ سلاطین مذکورہ کے آخری دور میں وہ الوالعزم اور عالی دماغ انسان اس خاندان نے پیدا کیئے جو اگر چاہتے تو ایک اشارہ سے اس عظیم الشان سلطنت کو تہہ و بالا کر سکتے تھے۔ خصوصاً محمد بٹ، ابدال بٹ، تازی بٹ تو ایسے دل و دماغ کے انسان ہو گذرے ہیں۔ جن کا اورنگِ کشمیر پر ایسا قبضہ تھا کہ وہ جس وقت چاہتے بادشاہ وقت کے سر پر سے تاج اٹھا کر ایک معمولی شخص کے سر پر رکھ دیتے۔ تو خود بادشاہ کو اُف کرنے کی جُرأت نہ تھی۔ اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ بادشاہ کچھ شطرنجی بادشاہ تھے۔ نہیں بلکہ وہ الوالعزم تاجدار شاہنشاہ ایسی طاقت رکھتے تھے کہ ان کی شمشیر زنی سے تمام ہمسایہ اور ہم عصر سلطنتیں کانپ رہی تھیں۔ اور ان کی شمشیر خارا شگاف نے اکبر جیسے طاقتور شاہنشاہ ہند کے حواس

باختہ کر دیئے تھے۔ چنانچہ اس خاندان کے حالات اس کتاب کے اندر سلطان الفقرا کے آبا و اجداد کے حالات میں وجہ تسمیہ صفا پور کے تحت مفصل درج ہوئے ہیں۔ قبل ازیں یہ لکھا جاچکا ہے کہ خطۂ کشمیر میں ہزاروں اولیائے کبار، عالم، روشن دماغ، فلاسفر، محقق، شاعر، خوشنویس پیدا ہوئے ہیں۔ جن کے حالات اور کارنامے ایک دنیا کو حیرت میں لانے والے ہیں۔ اور جو اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ مگر نہایت افسوس ہے کہ ان کے اکثر حالاتِ زندگی ہنوز پردۂ عدم میں پڑے ہوئے ہیں۔ جن شاہسواروں نے روحانی طاقت سے ایک عالم کو تسخیر کیا تھا۔ باوجود تھوڑا عرصہ گذرنے کے آج ان کی اولاد میں سے کوئی شخص نہیں جانتا۔ کہ آیا وہ کس سنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ اور کس سنہ میں روحانی دنیا کو فتح کر کے عالم بقا میں خیمہ زن ہو گئے۔ اور کہاں ان کا مرقد ہے۔ اگر ان کا تذکرہ کسی فارسی کتاب میں ملتا ہے تو وہ بھی مختصر اور غیر تسلی بخش۔ اور منتشر صورت میں اول تو ان کتابوں پر ''اسمش معلوم و جسمش معدوم'' کا مقولہ صادق آتا ہے۔ دوم اب فارسی مذاق روز بروز کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی طرف لوگوں کا بہت کم رجحان ہے۔ اگر شاذ و نادر کہیں کوئی شخص ان کتابوں کے دیکھنے کی اہلیت رکھتا بھی ہے تو وہ ''بدست اندر دُرم نیست'' کے مطابق ان کے خرید نے اور مہیا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں نے جدید تہذیب کی روشنی سے ترقی کے میدان میں قدم رکھا ہے دیگر لوازمات زندگی کے ساتھ یادگار سلف کو بھی قومی نصب العین قرار دیا ہے

ہر ایک مہذب قوم نے قومی مصلحوں اور ریفارمروں کے کارنامے روشن کر کے آئندہ نسلوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی شاہراہ پیدا کی ہے۔ بلکہ اس فن میں یہاں تک ترقی ہوئی ہے کہ ادھر کسی الوالعزم انسان نے دنیا سے رحلت کی۔ اُدھر اس کے حالات زندگی شائع ہو گئے۔ یہ نئی روح ہندوستان میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔ لیکن مسلمانان کشمیر کی غفلت کسی طرح بھی دور نہ ہوئی اس غفلت اور کوتاہی کے جو نقصانات اس قوم کو پہنچ رہے ہیں۔ وہ بھی کچھ معمولی نہیں۔ بلکہ اس کی تلافی میں صدیاں صرف ہونگی۔ آج دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ہمیں جاہل، بزدل، بے غیرت، کم حوصلہ، دروغ بیان خیال کرتی ہیں۔ یہ عیوب کچھ ہماری موجودہ نسلوں پر ہی حاوی نہیں کئے جاتے۔ بلکہ وہ قدیم سے ہمیں نسلاً بعد نسلاً ایسا ہی مانتے ہیں۔ حالانکہ اگر کوئی بتانے والا ہو تو ان کو معلوم ہو جائیگا کہ یہی وہ جاہل ہیں۔ جن کے فاضل اور عالم بزرگوں کے آگے معترضین کے اسلاف کی گردنیں ادب سے جھک جاتی تھیں۔ اور فضلائے عالم کا ان کے حلقہ تلمذ میں آنا کمال فخر تھا۔ اگر وہ یہ جانتے تو ہرگز دنیا کی ذلیل ترین قوموں میں ہمیں شمار نہ کرتے۔ کاش! کوئی شخص اس کوتاہی کو پورا کر کے ایسے معترضین کو ثابت کر دیتا۔

کائے حریفان ہمچو تو مانیز رندان بودہ ایم
خاک گردیدیم و خشتیم این زمان بالائے خم

موجودہ تہذیب کے زمانہ میں مسلمانان کشمیر کو عالمگیر جہالت نے اسقدر پامال کر دیا تھا کہ اقصائے ہند میں کوئی کشمیری نژاد مسلمان باوجود ذات قابلیت رکھنے کے اپنا کشمیری ہونا ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ لفظ ''کشمیری'' ہزار عیبوں کا ایک مرکب لفظ تصور کیا جاتا تھا۔ خدا بھلا کرے فدائے قوم منشی محمد الدین صاحب فوقؔ کاشمیری ثم لاہوری کا جنہوں نے اس طوفان بے تمیزی کو محسوس کر کے بذریعہ کشمیری میگزین کشمیری قوم کی اصلیت پر ذرا روشنی ڈالی۔ جس کا نتیجہ سب سے پہلے یہی ہوا کہ ہند میں اب کشمیری مسلمان کم از کم اپنی قومیت کو پوشیدہ نہیں رکھتے۔ اور اس کے عملی ثبوت کے لئے کشمیری کانفرنس کا وجود کافی ہے۔ اگرچہ ہنوز گل مقصود سے اس کا دامن بھی پُر نہیں ہوا۔ کیونکہ نہ تو اسے واقعات سلف کا کافی سرمایہ ہاتھ آیا۔ اور نہ ہی ہماری غافل اور نیم مردہ قوم نے اس کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کی۔ حالانکہ وہ میرے اس خیال سے (ہمارے اسلاف کے کارنامے محتاج اشاعت ہیں) پورا ہم آہنگ تھا۔

میرے دل میں عرصہ سے یہ تمنا چلی آتی ہے کہ میں مفتخر متقدمین کشمیر کے حالات زندگی کو فرداً فرداً کتابی صورت میں مروجہ زبان (اردو) کا لباس پہنا کر اہل دنیا کے آگے پیش کروں۔ لیکن بوجوہات چند در چند یہ خیال عالم وجود میں نہ آسکا۔ سب سے پہلے مجھے قدرت نے معاشرت کی طرف سے ایسا مجبور کر رکھا کہ مجھے ایسی تمناؤں کی تکمیل کا موقعہ ہی نہ ملا۔ میں عہد طفولیت سے ہی شکم پروری کے دھندوں میں پڑ گیا گویا میرے ہی

لئے کہا گیا تھا۔

روز و شب در فکر روز و شب گذشت
ہمچو شمعم زندگی در تب گذشت
در کلان سالی غمِ نان خوردہ ایم
خورد سالی در غم مکتب گذشت

تاہم اس خبط سے کبھی میرا دماغ فارغ نہ رہا۔ شاید کسی نہ کسی وقت قوم کی کچھ نہ کچھ خدمت کر کے اس کمی کو کسی حد تک پورا کرتا۔ مگر افسوس ہے کہ سلف صالحین کی تصنیفات اور عدیم المثال کتابیں میرے ہاتھ نہیں آئیں ایک تو وہ غیر مطبوعہ ہونے کے باعث نہایت کمیاب ہیں۔ اور ملک میں ان کی نقلیں بالکل کم ہیں۔ پھر اگر شاذ و نادر کامل تجس کے بعد کسی جگہ ایسی کتاب کا پتہ لگ بھی جاتا ہے تو مالک کتاب دکھانے میں بُخل کرتا ہے۔ ایک نظر سے بھی کسی طالب علم کو اس کی طرف دیکھنے نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ وہ کتاب آخر کیڑوں کی خوراک بن جاتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بُخل کا یہ مرض کشمیر میں عرصہ دراز سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ آج سے تین سو برس پہلے جناب حضرت جامع الکمالات صوری ومعنوی شیخ یعقوب صرفی کشمیری قدس اللہ سرہ اپنی تصنیف مسلک الاخیار میں اس طرح اس بُخل کی شکایت کرتے ہیں۔

عالمے از جمع کتب کے شود
آن ہمہ بے علم چو لاشے بود
نے تو ازانِ فایدہ گیری نہ غیر
زانکہ بود بُخل تو متاع خیر
از کتبست بہرہ نگیرند انام
طمعۂ کرمان ۔شود آنھا تمام

اس عدیم المثال بُخل نے ملک کے بے بہا جواہرات اور انمول کتب خانے تباہ کر دیئے ہیں۔ قرآن شریف اور کتب احادیث وغیرہ کو یہ لوگ عام طور پر دکھا سکتے ہیں۔ مگر کشمیری مصنفوں کی نامطبوعہ کتابوں کے لئے یہ بُخل اب بھی ایسا ہے۔ جیسا کہ آج سے تین سو سال پہلے تھا۔

میں نے یہ کوشش تمام شعرائے کشمیر کی چند غیر مطبوعہ تصانیف فراہم کی ہیں۔ جن کو میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور شائع کر دونگا۔ جس سے یہ ثابت ہو جائیگا۔ کہ میرا دعویٰ اپنے اندر کہاں تک صداقت رکھتا ہے۔ فی الحال میں بحیثیت ایک سوانح نگار کے پبلک میں روشناس ہوتا ہوں۔ گو یہ کام میری طاقت اور لیاقت سے بلند ہے۔ لیکن شوق دامنگیر ہوا۔ جس سے خیالات قابو میں نہ رہے اگر حضرت سلطان الفقرا کی درگاہ فلک پائگاہ میں یہ ناچیز ہدیہ قبول ہو گیا اور اگر ارباب دانش و علم و دوست اصحاب نے میری اس کوشش کی قدر کی۔ تو آئندہ بھی اسی طرح سلف صالحین اور بزرگان متقدمین

کے حالات پیش کرتا رہونگا۔

حضرت سلطان الفقراء کی خدمت میں اکثر تعلیم یافتہ اصحاب حاضر رہتے تھے۔ مگر کسی شخص نے ان کی حیات مجازی میں ان کے حالات۔ کشف وکراما اور ملفوظات وغیرہ قلمبند نہیں کئے۔ حتیٰ کہ راقم کو بھی اس زمانہ میں ایسا کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ ۱۳۳۴ سنہ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد بھی چار سال تک اس عاجز کو دنیاوی مکروہات نے اس طرف راغب نہ ہونے دیا۔ آخر جب اس شوق نے غلبہ کیا تو سب سے پہلے ۱۳۳۸ھ کے موسم سرما میں راقم مقامی واقعات کی دریافت کے لئے روانہ صفاپورہ ہوا۔ وہاں جناب حضرت سلطان الفقرا کے برادرزادہ عبدالغفار صاحب اور دیگر خدام و معمر اشخاص سے تین یوم تک یاد داشتیں لیتا رہا۔ اور خاص قابل تذکرہ مواقعات یعنی باغ جروگہ۔ کوہ ہلدر وغیرہ کا بھی ملاحظہ کیا۔ مقامی حالات و واقعات کو کامل تفتیش اور ردوقدح اور کثرت رائے کے بعد حوالہ قلم کیا۔ لیکن حضرت اقدس کے سال پیدائش اور رحمہ شاہ صاحب قلندر کی وفات اور ان دونوں بزرگوں کی ملاقات کا مرحلہ طے نہ ہوا۔ اس معاملہ میں جس قدر دائرہ تحقیقات کو وسعت دی گئی۔ اصل مقصد اور بھی زیادہ پیچیدہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک عجیب قسم کی تشویش پیدا ہوگئی۔ تیسری رات کو جبکہ میں حضرت اقدس کے خلوت کدے کے بیرونی کمرہ میں سویا ہوا تھا۔ آنحضورؐ خواب میں جلوہ گر ہوئے دست مبارک کو آسمان کی طرف اُٹھا کر فرمایا۔ کہ لکھو جو کچھ لکھنا ہے۔ پھر فرمایا کہ میری والدہ کا نام رحمہ دیدی تھا۔ اور اسی کو

رحمہ صاحبہ بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دو سال تک دودھ پلایا ہے میں دنیا میں آیا تو رنجیت دنیا سے رخصت ہوا"۔ اس خواب کو میں نے رویائے صالحہ قرار دیا۔ اور اسی سے میرے توہمات دور ہوئے۔

اس خواب کے مختصر الفاظ اپنے اندر مطول واقعات لئے ہوئے ہیں جس کی تعبیر میں اس طرح پر کرتا ہوں۔ کہ حضرت اقدس کا سال پیدائش وہی سال ہے۔ جس سال شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا ہے یعنی ۱۸۳۹ء چونکہ کشمیر بھی اس زمانہ میں سکھوں کے ماتحت ہی تھا۔ اس لئے بادشاہ وقت کے انتقال کا حوالہ دیا گیا۔ جناب رحمہ شاہ صاحب قلندر اُن کی والدہ تھے اور انہوں نے اسی کا دودھ پیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قلندر صاحب موصوف سے حضرت اقدس کو روحانی فیض ملا ہے۔ اور انہوں نے ان سے باعتبار خوردسالی شیر معرفت دو سال تک نوش فرمایا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے اندرونی واقعات سے روشن ہو جائیگا۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ قلندر صاحب کا سال رحلت ۱۸۴۱ء ہے۔

ما بقی حالات میں نے حضرت سلطان الفقراء کے فرزند معنوی روحانی جانشین اور خلیفہ خاص جناب پیر غیاث الدّین شاہ صاحب سے دریافت کر کے قلمبند کئے۔ اور دیگر خاص ارادتمندان و عام مریدان و معتقدان سے بھی اکثر حالات معلوم ہوئے۔ لیکن ایسے کسی واقعہ کو کسی ایسے راوی کی زبان سے قلمبند کرنے سے پہلے میں نے راوی کی راستبازی اور صادق القول ہونے کی خارجی شہادتیں حاصل کیں۔ جب میں نے کشف و

کرامات وخرق عادات کی نسبت یاداشتوں کو جمع کیا۔ سینکڑوں کراماتیں بیان ہوئیں۔ جو بلحاظ روایات ودرایات سب معتبر تھیں۔ ان میں سے بخوف طوالت صرف گیارہ کرامتیں درج کتاب کیں۔ ملفوظات کے زیادہ تر واحدراوی جناب غیاث الدین شاہ صاحب ہیں کتاب کے بہت سے واقعات راقم کے چشم دید بھی ہیں۔

آج کل کی تہذیب میں سوانح عمریوں کے ساتھ بالعموم صاحب سوانح کا فوٹو بھی درج کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ ان کے مریدوں اور مخلصوں نے جب ان کے کشف کرامات و دیگر حالات قلمبند نہیں کئے تو بھلا فوٹو کون حاصل کرتا۔ البتہ تحقیقات سے اس قدر معلوم ہوا۔ کہ چند ایک سیاح یورپین صاحبان نے ان کے فوٹو لئے ہیں۔ لیکن انکا دستیاب ہونا ناممکن تھا۔ میں نے اس کتاب میں حضرت اقدس کا لقب سلطان الفقرا تحریر کیا ہے۔ لیکن یہ میرا ہی قرار دادہ اور مجوزہ نہیں۔ بلکہ یہ لقب ان کو اپنے روحانی والد جناب رحمہ شاہ صاحب قلندر نے بروقت پیدائش بطور پیشن گوئی دیا تھا۔ جو بعد میں اس طرح پر ظہور پذیر ہوا کہ حضرت اقدس تمام ملک میں بادشاہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ اور چونکہ ان کو لفظ فقیر سے بہت کچھ انس اور پیار تھا۔ اسلئے سلطان کے ساتھ ملا دیا گیا۔

بعض لوگ آنجناب کو قلندر کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ جسکے وجوہات میرے نزدیک جناب رحمہ شاہ صاحب قلندر کا روحانی واسطہ اور

ہندی قلندر کی ملاقات جناب رسول شاہ صاحب قلندر لاری کی چند روزہ مصاحبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ ورنہ حضرت اقدس کے اوضاع واطوار بالکل قلندرانہ نہیں تھے۔ میں نے بھی بعض لوگوں کے اس قرار دادہ لقب کورایگاں اور ضائع نہیں جانے دیا۔ کیونکہ اہل اللہ اس لفظ (قلندر) کی قدر کرتے آئے ہیں۔ بلکہ انہوں نے بعض دفعہ فخر یہ بھی کہا ہے۔ چنانچہ قطب الاقطاب غوث الاعظم جناب حضرت شیخ سید عبدالقادر صاحب جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

ما ز دنیا کو قلندر خانۂ عشقِ خداست
سوئے عقبیٰ عاشق و مست و قلندر می رویم

علاوہ ازیں حضرت بوعلی قلندر پانی پتی (نزیل دہلی) ایک بہت بڑے بزرگ قلندر ہی کے نام سے مشہور ہیں۔

آخر میں بقدر استعداد ولیاقت محنت وکوشش سے اس کتاب کو مکمل کر کے پبلک میں پیش کرتا ہوں۔ لیکن درحقیقت میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ میری ظاہری آنکھیں اس آفتاب عالم تاب کے نور کو کما حقہ نہ دیکھ سکیں۔ اور میرے آلودہ اور مکرؤہ دل کو وہ جلوہ محسوس نہ ہوا۔ میرے ٹوٹے ہوئے ہاتھ پاؤں اس بحر بے کنار کی شناوری نہ کر سکے۔ میرا خیال اس ایوان شاہی کے پہلے زینہ تک بھی نہ پہنچ سکا۔ پس اس کوتاہی اور نارسائی پر بہت ہی شرمندہ ہوں۔ اور عرق آلود ہاتھوں سے ان اوراق کو پیش کرتا ہوں۔

میں نے حضرت سلطان الفقرا کے حالات قلمبند تو کیے۔ اور کشف و کرامات وغیرہ پر حتی الوسع خامہ فرسائی کی۔ مگر ایک محدود علمیت کا آدمی ہونے کی وجہ سے اور روحانی سرمایہ کی تہی دستی سے ان کی شان اور رتبہ ہر گز پہچان نہ سکا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ دنیا میں سمجھنے والے ابھی موجود ہیں۔ پس ؎

منکر نتوان گشت اگر دم زنم از عشق
این نشہ بہ من گر نبود با دِگرے ہست

فقط

خاکسار

ابوالامین غلام احمد مہجورؔ

شہید گنج، سرینگر، کشمیر

۱۰ رشعبان المعظم ۱۳۴۰ ہجری



نالۂ مہجور

اے صبا رفتار پیکِ خوش خرام | اے امین لعل و دُر ہائے کلام
اے بقائے مایۂ صبر و قرار | اے تحمّل بخشِ مرغِ دلفگار
اے امانت دار یار مئے فروش | اے خریدارِ دلِ گم کردہ ہوش
اے طبیبِ علّتِ ہر حرص و آز | اے تویی درماندگان را چارہ ساز
اے حقیقت دانِ رازِ خیر و شر | اے کلیدِ مخزنِ علم و ہنر
اے شفائے دردِ جان و رنجِ تن | اے تویی ہمرازِ من دمسازِ من
اے انیسِ خلوتِ دالدادہ گان | دستگیر و مونسِ افتادہ گان
اے نگاہت مرہمِ زخمِ جگر | در لبانت نوش دارو سر بسر
اے پیامت رخنہ سازِ عقل و ہوش | عقل ظاہر بین و ہوشِ حق فروش
اے گدائے جنسِ رنج و درد و غم | بر کفت جامِ گدایی جامِ جم
زندگی بخشِ سقیم جان بہ لب | وی علاجِ نالہ ہائے نیم شب

واقفِ اسرارِ عرش و لامکان ‏ ہان! تو یِی نزدیک از کروبیان

رہ نوردِ منزلِ جانانِ من ‏ اے فدائے گردِ راہت جانِ من

غم ربائے عاشقِ شوریدہ سر ‏ اے سبک رفتار از باد سحر

محرمِ کوئے نگارِ دلنواز ‏ اے سبق آموز دیوان نیاز

آشنائے لذّتِ دردِ فراق ‏ اے تو یِی غوّاصِ بحرِ اشتیاق

عندلیب و ہدہد و شہبازِ من ‏ طوطئے شکر زبان جادو شکن

ماہرِ اسرارِ شانِ سروری ‏ راز دانِ شوکتِ پیغمبری

استواری بخشِ زنجیرِ جنون ‏ کاشفِ سر بستہ احوالِ درون

پیکرِ امید و تصویرِ سُرور ‏ شہہ سوارِ وادئے قرب و حضور

ناخدائے کشتیِ بحرِ فراق ‏ پردہ دارِ رازہائے نُہ رواق

رہنما سوئے شبستان وصال ‏ باغبانِ باغ و بستانِ جمال

سرمۂ چشم و نگاہِ دُور بین ‏ آئینہ دارِ نگارِ نازنین

زمزمہ پرداز سازِ کاینات ‏ مرحبا اے ساقیِ جامِ حیات

جائے آرامت تجلّی گاہِ حق ‏ بردہ منزلہا زہم جنسان سبق

مرسل سلطان خوبانِ جہان ‏ مورد الطاف ہائے بیکران

اے کرا طاقت کہ بنویسد جواب ‏ بر پیامت سوئے آن عالی جناب

دُرکش و غوّاص دریائے علوم ‏ عاشقِ سرباز، مولانائے رومؒ

خواست چون دادن جوابِ یک پیام	هفت دفتر گفته ماندش ناتمام
بهتر و بالاترے سویم خرام	گوازان حضرت چه آوردی پیام
یکدمے از سیرِ عرش و الامکان	باز آ اے نورِ جانِ عاشقان
صد هزاران گل زِ گلشن چیده ای	زیرِ جامه باغ ها پوشیده ای
لنگر افگن شو کنارِ بحرِ عشق	شورشی پیدا کُن اندر شهرِ عشق
یادِ گُل ده بُلبُلِ دیوانه را	لذّتِ سوزشِ دلِ پروانه را
خاکیان را قوّتِ پرواز ده	طاقتے از دست رفته باز ده
اے خوشا روزی که آیی سوئے من	همچو بادِ نو بهار اندر چمن
تا دلِ افسرده ام غنچه مثال	سربر افرازد ز حالِ انفعال
چون قدم شیدائے دلدارِ ازل	این معما کے شود غیر از تو حل
سر کنم گر داستانِ هجرِ یار	ختم نتوان گشت تا روزِ شمار
لیک جسمِ من ز دردِ اشتیاق	شد سراپا پیکرِ هجر و فراق
از نگاهِ نازِ او شیدا شدم	بس بود این توشه راهِ عدم
از وصالش مانده ام مهجور و دور	کے رسد جانم بدان دار السرور
گرچه مهجورم زِ مهجوری چه غم	بلبلے از بوستانِ شاهدم
حُسنِ یار از هر طرف جلوه گر است	چشمِ ظاهر بین از و اعمیٰ تر است
شد حجابِ عقلِ ظاهر دیده دوز	المدد! اے اخترِ عالم فروز

عاشقان را دین وایمان یادِ دوست — بہتر از ذکر و عبادت نام اوست

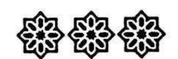
ذکرِ دلبر قوّتِ جان حرزِ تن است — زین سبب عاشق زہر غم ایمن است

خوردہ گیرے خوردہ گیر د چیست غم — نیست بر دیوانہ و عاشق قلم

ہان! بیا اے طایرِ عرش آشیان — دہ بہ من پیغامِ یارِ دلستان

از پیامت شد دلم سرشار و مست — توکہ دادی روح را یاد الست

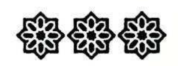
غلام احمد مہجور

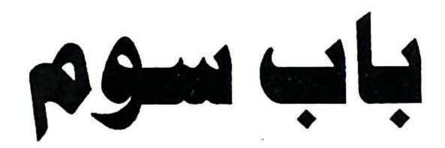


باز گو از نجد و یاران نجد

تا در و دیوار را آری بہ وجد

مولوی معنویؒ

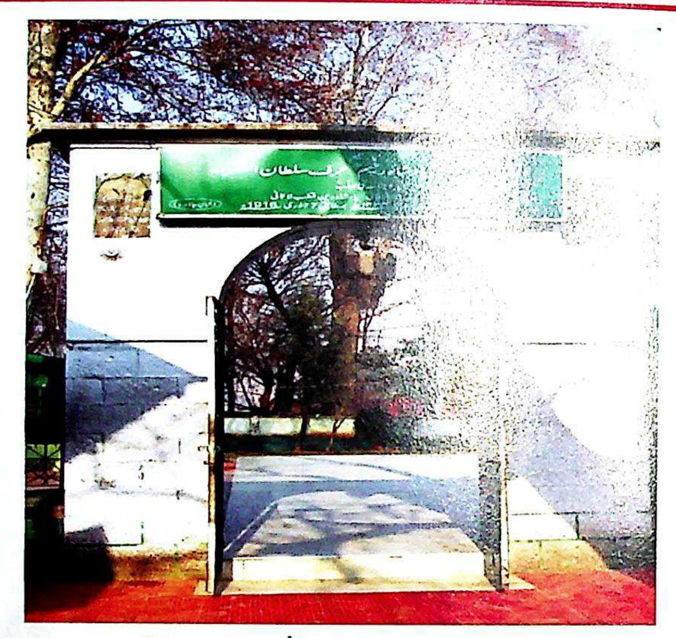




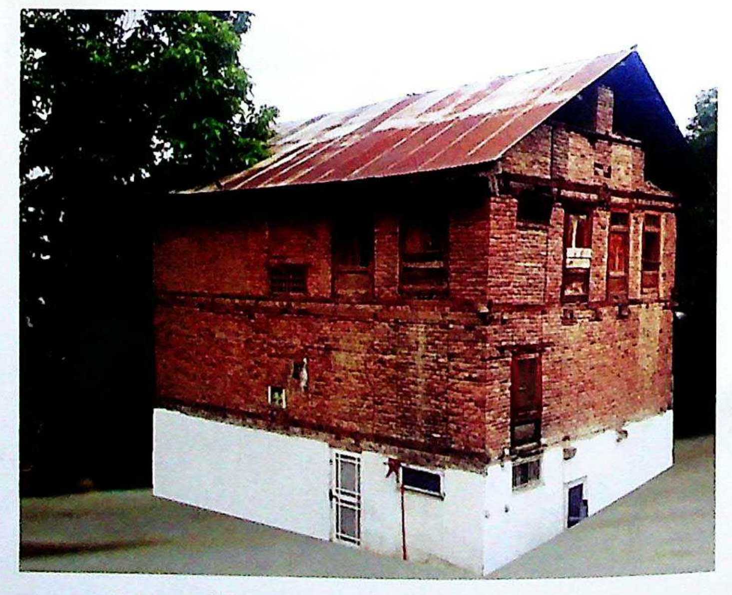
باب سوم



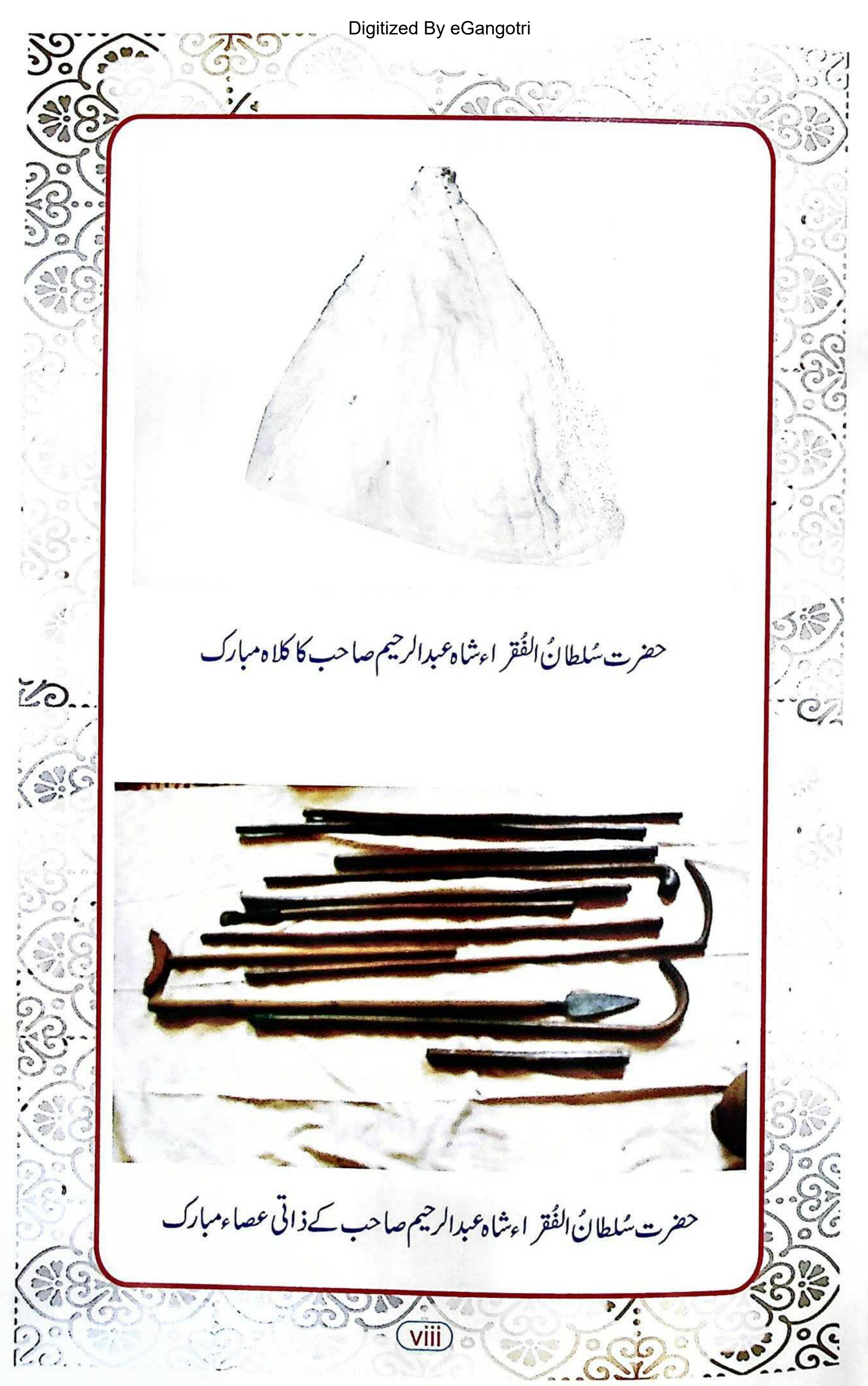
مبارک حضرت سلطان الفقراء شاہ عبدالرحیم صاحب صفاپورہ



بابِ ورود، آستانِ عالیہ جناب حضرت سُلطانُ الفُقراءشاہ عبدالرحیم صاحب، صفاپورہ

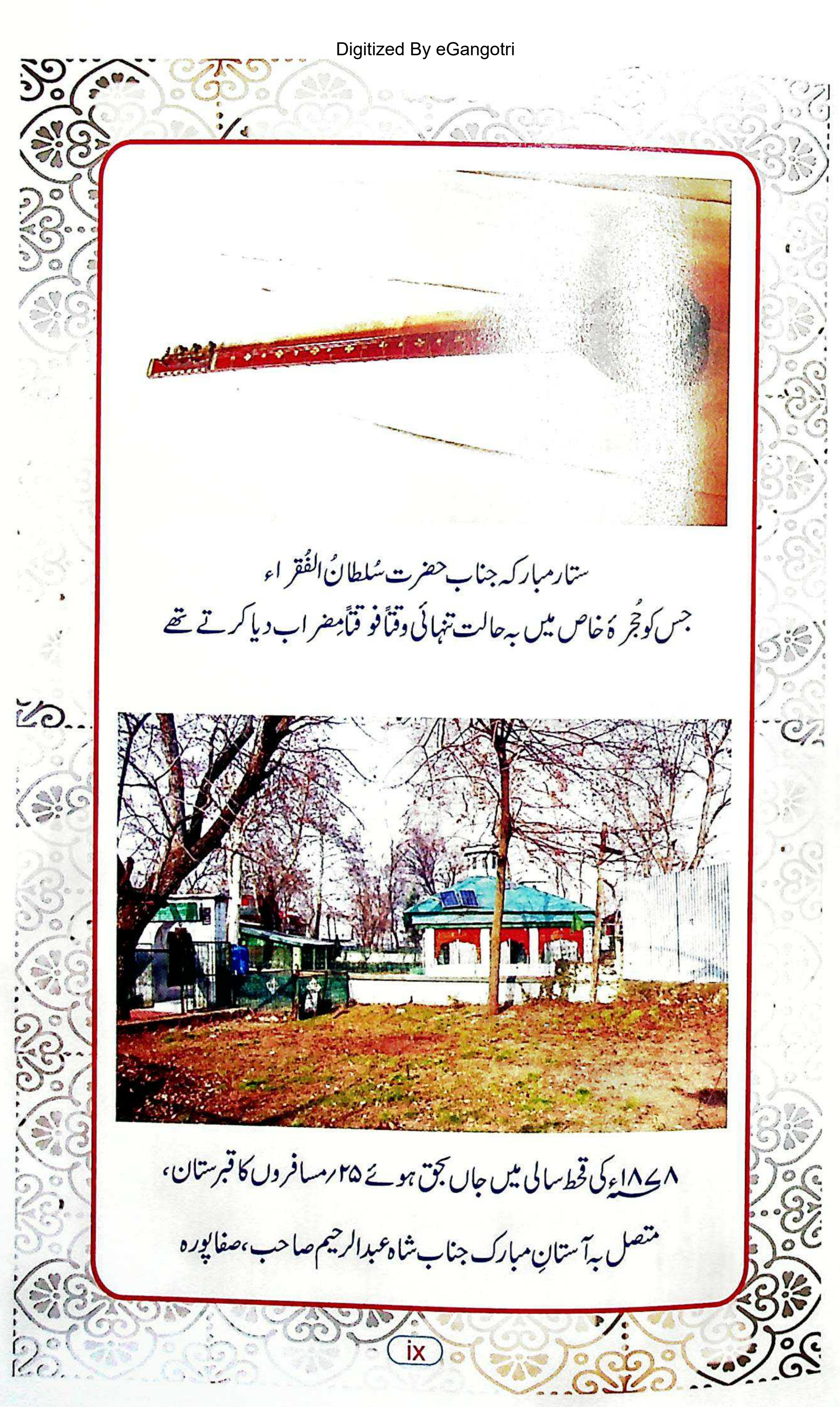


حضرت سُلطانُ الفُقراءشاہ عبدالرحیم صاحب کا رہائشی مکان، صفاپورہ



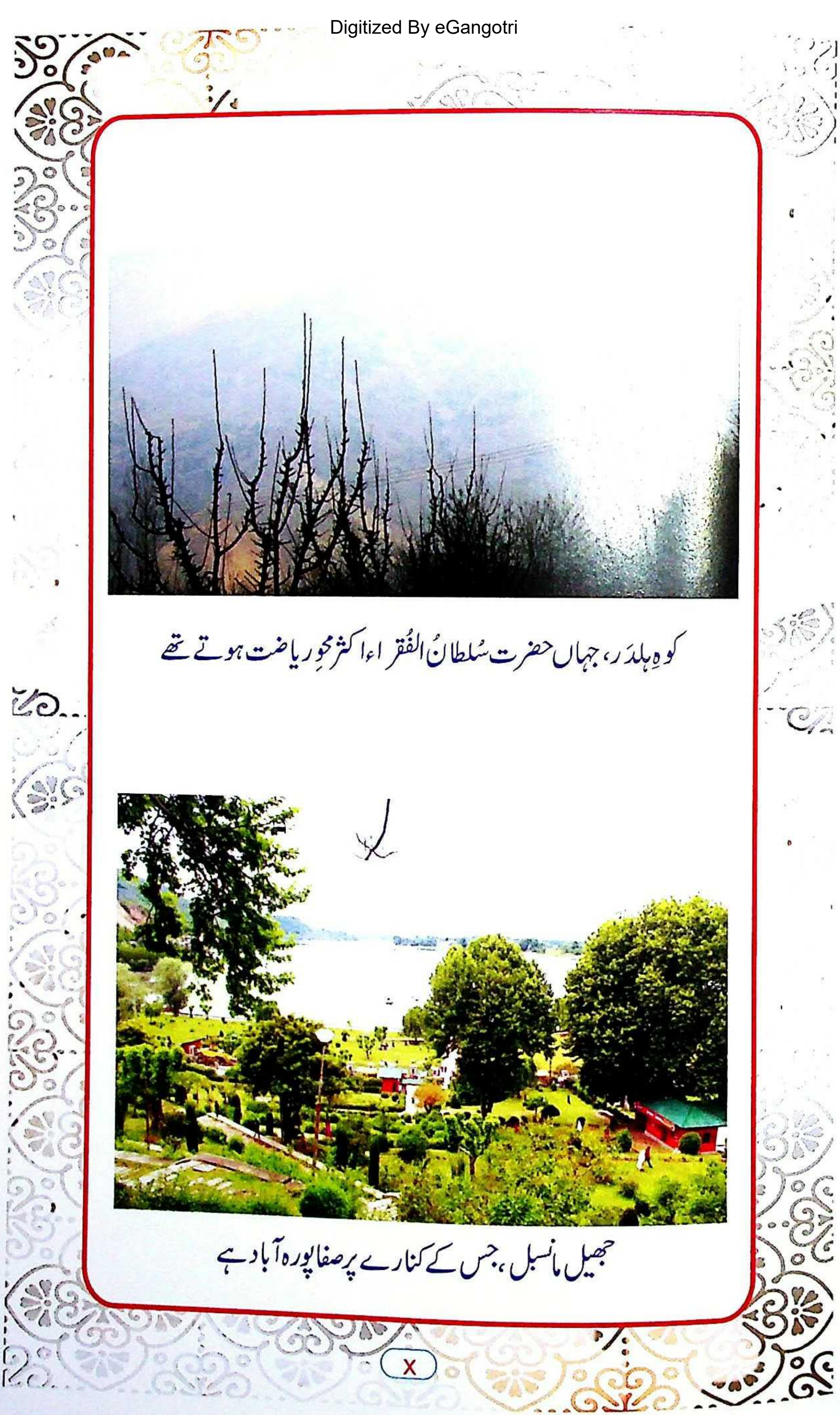
حضرت سُلطانُ الفُقر اءشاہ عبدالرحیم صاحب کا کلاہ مبارک

حضرت سُلطانُ الفُقر اءشاہ عبدالرحیم صاحب کے ذاتی عصاء مبارک



ستار مبارکہ جناب حضرت سُلطانُ الفُقراء
جس کو حُجرۂ خاص میں بہ حالت تنہائی وقتاً فوقتاً مضراب دیا کرتے تھے

۱۸۷۸ء کی قحط سالی میں جاں بحق ہوئے ۲۵ر مسافروں کا قبرستان،
متصل بہ آستانِ مبارک جناب شاہ عبدالرحیم صاحب، صفاپورہ



کوہِ ہلدر، جہاں حضرت سُلطانُ الفُقراء اکثر محوِ ریاضت ہوتے تھے

جھیل مانسبل، جس کے کنارے پر صفاپورہ آباد ہے

حضرت سُلطانُ الفُقراء کے آبا و اجداد

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن ___ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْن۔ وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ نَبِیِّنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْن ۝

شاہان افاغنہ کی ابتدائی حکومت میں خطہ کشمیر کی تحصیل خاص سرینگر پرگنۂ لار۔ موضع صفاپور (تفصیل ''حضرت سلطان الفقراء اور صفاپور۔ تاریخی پس منظر'' میں درج ہے۔ صفحہ نمبر: ۱۴۵) میں ایک قدیمی اور تاریخی زمیندار خاندان ''بٹ'' کا ایک نیک نام اور ذی عزت ممبر ''عارف بٹ'' نامی آباد تھا۔ جو متقی اور نیکوکار ہونے کے علاوہ سخاوت میں بھی خاص طور پر مشہور تھا اور حضرات صوفیائے وقت مشائخان روزگار۔ فقرائے صفا شعار کی خدمت اور صحبت سے اسکو خاص دلچسپی تھی۔ گویا اس کے اخلاقِ حسنہ و عادات خجستہ نے اسے اسم با مسمیٰ ثابت کر دیا تھا۔ خداوند کریم نے اسکو دو لڑکے عطا کئے تھے۔ ایک کا نام ''رحمہ بٹ'' اور دوسرے کا نام ''اعظم بٹ'' تھا۔ عارف بٹ کی رحلت پر اعظم بٹ گھر کے سیاہ و سفید کا ذمہ وار ہوا۔ ''رحمہ بٹ'' کے آثار عہد طفولیت ہی سے کچھ غیر معمولی تھے۔ تعلقات

دنیوی سے عاری اور بزرگوں اور نیک لوگوں سے اکثر ماموس رہتا تھا چنانچہ وہ خوردسالی میں ہی (جبکہ اس کی عمر بارہ سال کے قریب تھی) بحالت ناکتہ خدائی گھر سے مفرور ہو کر کسی طرف چلا گیا۔ اور مدت دراز تک مفقود الخبر رہا۔ آخر ایک عرصہ کے بعد جب لوگوں نے اُسے موضع صفاپور میں دیکھا تو اس کی وضع قطع بالکل قلندرانہ تھی۔ اپنی مادری زبان کی نسبت زبان فارسی زیادہ صاف بولتا تھا۔ جس سے گمان ہوتا تھا کہ وہ زمانہ مفقود الخبر ی ایران کے کسی حصہ میں گذار آیا ہے۔ گاؤں میں پہنچ کر قلندر صاحب نے گھر سے دور ایک میدان میں ڈیرا لگایا۔ لوگ ایک ''عجوبہ'' سمجھ کر بکثرت ان کے پاس آنے جانے لگے۔ آخر اُن سے کچھ کشف ، وکرامات بھی ظہور پذیر ہوئے۔ جن سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ حتیٰ کہ صوبیدار وقت بھی انکی ملاقات کا خواہشمند ہوا۔

اس زمانہ میں زمان شاہ دُرّانی بادشاہ کابل کی طرف سے عبداللہ خان الکوزی صوبیدار کشمیر تھا۔ وہ بہ نفس نفیس جناب رحمہ صاحب قلندر کی خدمت بابرکت میں بمقام صفاپور حاضر ہو کر ان کے کمالات کا قایل و معترف ہوا۔ سرکاری باغ موسومی ''جروگہ'' میں ان کے لئے ایک تکیہ بنوایا۔ اور باغ بھی ان کے نام پر وقف کر دیا۔ علاوہ اس کے خزانہ شاہی سے کسی قدر وظیفہ ماہوار اخراجات لنگر کے لئے مقرر ہوا۔ جو اخیر حکم درانیہ تک برابر جاری رہا۔ قلندر صاحب نے بقیہ ایام زندگی اسی باغ میں بسر کئے۔

❀❀❀

حضرت سُلطان الفُقّرا ءاور صفاپور

تاریخی پس منظر

شاہان کشمیر کے عہد حکومت میں وادی کشمیر سیاسی انتظام کے لئے ۳۶ / بلکہ بعض حالات میں ۴۲ پرگنوں پر تقسیم تھی۔ اس میں ملک کے اندرونی خفیف تغیرات زبان، طرزِ معاش، تمدن، آب وہوا کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا۔ موجودہ عہد میں حکومت نے سیاسی انتظام میں اس تقسیم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لیکن پرگنات کے نام ابھی تک بدستور باقی ہیں۔ انہی میں سے پرگنہ لار بھی ایک مشہور اور ممتاز پرگنہ ہے۔ جو سرینگر سے جانب مشرق وشمال دو پہاڑوں کے درمیان نالہ "سند ہو" کے دونوں کناروں پر دریائے جہلم کے مقامِ اتصال تک پھیلا ہوا ہے۔ علاقہ خاص طور پر سرسبز وشاداب ہے۔ بلحاظ آب وہوائے معتدل، کثرت انہار واشجار۔ افراط میوہ ہائے خوشگوار اور مقامات فرحت افزا و دلکشا۔ یہ پرگنہ تمام پرگنہ جات کشمیر پر فوقیت رکھتا ہے۔ بلکہ اس پرگنہ کی نسبت کسی محقق اور نفیس طبع شاعر کا یہ شعر مشہور ہے ؎

لار برکاخِ ملک تا لار است   برہمہ پرگنات سالار است

۷۹٦ھ میں جب جناب حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ کے فرزندارجمند جناب حضرت میر محمد صاحب ہمدانیؒ اپنے والد ماجد کے لگائے ہوئے اسلامی پودے کی آبیاری کے لئے کشمیر تشریف لائے۔ تو سلطان سکندر شہنشاہ کشمیر کا وزیر اعظم پنڈت سہہ بٹ کاکہ پوری، انکے دستِ مبارک پر مشرف اسلام ہوکر سیف الدین بٹ کے اسلامی نام سے مشہور ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد اسے ملک کا لقب بھی بارگاہ خسروی سے ملا اور اس کی صاحبزادی جناب حضرت میر صاحبؒ کے نکاح میں آئی۔ یہ شخص بعد میں ایک پُرجوش مسلمان ثابت ہوا۔ چنانچہ اس سے کشمیر کی مسلم مردم شماری میں نمایاں اضافہ ہوا ہے جس کے لئے اس کے سابقہ ہم مذہب مورخ اسے تلخ الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا مدّبر۔ روشن دماغ۔ بیدار مغز۔ دور اندیش خصوصاً سیاسی معاملات و مشکلات کو نبھانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا غالباً تبدیل مذہب پر اس کو اپنے گذشتہ ہم مذہب بھائیوں کی تحقیر و تشنیع نے بہ تقاضائے بشریت کسی زیادتی پر مجبور کر دیا ہوگا۔ جس وضعداری کو اس کے دشمن اس کا نصب العین قرار دے کر اس کے باقی اوصاف پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

اسلام سے پیشتر کشمیر کی وسیع سلطنت کا دارالخلافہ ''اندرکوٹ'' میں واقع تھا یہ جگہ آج کل موجودہ دارالخلافہ کشمیر (سرینگر) سے ۱۶ر میل کے فاصلہ پر جانب شمال دریائے جہلم کے غربی کنارہ پر ایک متوسط بلکہ معمولی درجہ کے گاؤں کی حیثیت میں موجود ہے۔ یہی وہ معزز اور مفتخر قطعۂ زمین

ہے۔ جہاں سے خطۂ کشمیر کے لئے اسلام کا لازوال سورج طلوع ہوا۔ قبولیت اسلام کے بعد ایک دو اسلامی تاجداروں نے مستقل طور پر اسی جگہ اپنا دور حکومت ختم کر دیا۔ لیکن انقلاب زمانہ سرینگر کی رونق کو روز بروز بڑھا رہا تھا۔ اس بناء پر سلطان سکندر سے پیشتر ہی سرینگر میں چند ایک ایسے مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ جن میں شاہان مذکورہ بعض اوقات بخیال تفریح و تبدیل آب و ہوا کچھ دن قیام کرتے تھے۔ مگر مستقل طور پر ابھی دارالسلطنت ''اندرکوٹ'' سے ''سرینگر'' تبدیل نہیں ہوا تھا۔ ملک سیف الدین بٹ کے محلات و مکانات رہائشی خاص سرینگر ''محلّہ راجؔ ویرکدل'' میں موجود تھے۔ مگر بادشاہ کو ایسے باتدبیر وزیر و مشیر کی جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی ناگذار گذرتی تھی۔ اس لئے مطابق فرمان شاہی وزیر اعظم نے اندرکوٹ سے ایک میل کے فاصلہ پر جانب مشرق پہاڑ کے دامن میں ''جھیل مانسبل کے شمالی کنارہ پر اپنے ٹھہرنے کے لئے وسیع پیمانہ پر محلات و مکانات تیار کرا کر ایک گاؤں کی طرح ڈالدی۔ اور گاؤں کا نام اپنے نام پر ''سیف پور'' رکھا۔ جو اس وقت تک باضافہ الفؔ و ہذف یؔ اور بہ تبدیل سؔ بہ صؔ صرف ''صفاپور'' کے نام سے مشہور ہے۔ اور اہل بصیرت کے دلوں میں اپنے بانی کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ملک سیف الدین بانی صفاپور نے اپنے محلات کے ساتھ ایک عالی شان باغ بھی سہ طبقہ بنوایا تھا۔ جسکے لئے ایک نہر نہایت دور فاصلہ نالہ ''سندھو'' سے کاٹ کر لائی گئی تھی۔ جو ابھی تک بدستور موجود ہے۔ اس باغ سے جھیل کا نظارہ نہایت دلفریب نظر آتا ہے۔

جب سلطان سکندر اور ملک سیف الدین کی وفات کے بعد سلطنت کشمیر کا دارالخلافہ مستقل طور پر سرینگر میں منتقل ہو گیا۔ تو موضع صفا پور کی رونق میں سوائے اس کے اور کوئی پیشی نہیں ہوئی کہ ملحقہ دیہات کے باشندوں نے اس گاؤں کو جائے امن تصور کر کے بغرض کاشتکاری یہاں کی سکونت اختیار کی۔

سلاطین کشمیر کے آخری دم تک سلطنت کشمیر کی مدار المہامی اور وزارت عظمیٰ ملک سیف الدین کے ہی خاندان میں رہی۔ اس خاندان سے محمد بٹ، تازی بٹ، ابدال بٹ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ جو نہایت مدبر۔ بیدار مغز، بہادر ہو گذرے ہیں۔ جن کو اورنگ کشمیر پر اس قدر اقتدار حاصل تھا کہ اگر چاہتے تو بادشاہ کے سر سے تاج اُٹھا کر کسی دوسرے کے سر پر رکھ سکتے تھے اور بادشاہ کو اُف کرنے کی طاقت نہ ہو سکتی تھی۔ حالانکہ وہ الوالعزم تاجداران ایسی طاقت رکھتے تھے کہ تمام ہمسایہ اور ہمعصر سلطنتیں ان کے نام سے کانپتی تھیں۔ بلکہ ان کی شمشیر خارا شگاف نے اکبر جیسے باجبروت شاہنشاہ ہند کے حواس باختہ کر دیئے تھے۔

تازی بٹ خاص طور پر فن سپاہ گری اور شہ زوری میں لاثانی تھا۔ چنانچہ کشمیری زبان کی ضرب المثل ''تازی بٹی کان'' یعنی تازی بٹ کی تیراندازی اسی بہادر شخص کی نسبت مشہور ہے۔

جب کشمیر میں شیعہ وسنی کے فروعی اختلافات پر اسلام میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور کشمیر کے اکثر برگزیدہ انسان شمشیر کے گھاٹ

اُتارے گئے، تو بعض اکابیران کشمیر کی رہنمائی اور امداد سے جلال الدین اکبر نے کشمیر کو فتح کرلیا۔ اس وقت کشمیر کا مدارالمہام ''ابدال بٹ'' موجود تھا۔ اس کو امان تو دے دی گئی۔ لیکن وہ وطن کا شیدائی کشمیر کی آزادی کے کھوئے جانے پر ہزار ہزار آنسو بہاتا رہتا تھا۔ نزدیک تھا کہ وہ کشمیر کی آزادی کے لئے پھر نقل وحرکت کرتا کہ صوبیدار وقت کو بروقت خبر ہوگئی۔ اس نے رپورٹ اکبری دربار میں گذارش کی جہاں سے بروئے حکم شاہی ابدال بٹ کا تمام خاندان اسیر کیا گیا۔ اور ان کی تمام جائدادیں معہ مکانات واراضیات موضع صفاپور ضبط ہوکر خالصہ قرار دی گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد جب جہانگیر بادشاہ ہندسیر کشمیر کے ایام میں جھیل مانسبل کے دیکھنے سے فارغ ہوکر ملک سیف الدین کے باغ میں گیا تو یہ جگہ اس کو بہت پسند آئی۔ بانی کے سلسلہ حالات میں بادشاہ کو اس خاندان کے پسماندگان کی محبوسی کا حال سنکر نہایت ترس آیا۔ اور حکم دیا'' کہ اُن کو رہا کردیا جائے اور موضع صفاپور میں اپنے موروثی زرعیات میں سے کسی قدر رقبہ ان کو گذارہ کے لئے دیا جائے جس پر وہ ایام زندگی بسر کرسکیں۔ البتہ اس خاندان کے کسی شخص کو شاہی امورات میں دخل دینے کا موقعہ نہ دیا جایے۔ اور اس باغ کو سرکاری طور پر آراستہ کیا جائے۔ اور اس میں چند ایک بارہ دریاں بھی تعمیر ہوں''۔ اس حکم کی تعمیل اس طرح ہوئی کہ باغ کی (جس کا نام اب ''باغ جروگہ'' ہے) چاردیواری پختہ بنوائی گئی۔ اور روشیں وغیرہ بھی نہایت صاف اور دلکش تیار ہوئیں اور باغ کے دونوں سروں پر جھیل کے ساتھ دو عالیشان برج بنائے گئے۔ جہاں سے جھیل میں کشتی رانی کا

نظارہ نہایت دلفریب نظر آتا تھا۔ اور ہر سہ طبقہ باغ میں نہر کے پانی سے حوض اور فوارے بھی تعمیر ہوئے۔ غرض عرصہ دراز تک یہ باغ ملک سیف الدین اور جہانگیر کی زندہ دلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بالکل ویران ہے چند پرانے درخت اور دیواروں و برجوں کے کھنڈرات، اور حوض وفواروں کے آثار، نہر کے نشانات، اینٹ و پتھر کی صورت میں بچشم حال اپنے بانیوں کی جدائی میں اشکبار ہیں۔

خاندان سیف الدین بٹ کے اسیر جب رہا کئے گئے، تو انہوں نے موضع صفاپور میں سکونت اختیار کر کے زندان کی سختیوں سے کاشتکاری پر گذارہ چلانا منظور کر لیا۔ گاؤں کے ایک حصہ میں انہوں نے اپنے لئے مکانات بنوائے اور اس محلّہ کا اندرونی نام ''بٹ پورہ'' مشہور ہوا۔ جہاں ملک سیف الدین بٹ اور سلطنت کشمیر کے وزیر اعظم اور مدارالمہام کی اولاد کاشتکاری اور کھیتی باڑی کا کام کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انقلاب زمانہ نے ان کو عام زمینداران دیہہ کے ساتھ رشتہ ناطہ میں ملا دیا یہاں تک کہ محلّہ بٹہ پورہ بھی اسی خاندان کے لئے مخصوص نہیں رہا۔ البتہ گاؤں کی نمبرداری (سیرواری) ابھی اسی خاندان میں چلی آتی ہے۔ اسی خاندان کے ساتھ جناب حضرت سلطان الفقراء تعلق نسبت رکھتے ہیں جنکے حالات زندگی پر یہ اوراق لکھے جا رہے ہیں۔

(ماخوذ از رسالہ ''سیف الاسلام'' فارسی قلمی۔ مصنفہ مُلا ابوالقاسم قاضی کشمیر ۱۰۳۱ھ بانی ''قاضی باغ'' واقعہ مشرقی کنارِ جھیل مانسبل۔ صفاپور کشمیر)۔

❁❁❁

محمد عظیم خان صُو بیدار کشمیر اور حضرت رحمہ شاہ صاحب رحؒ قلندر

دُرّانیہ حکومت کی طرف سے کشمیر میں تعینات سب سے ظالم صُو بیدار محمد عظیم خان تھا۔ جو بغایت ظالم و جابر اور نہایت حریص و طامع تھا۔ بلکہ تاریخ نے کشمیر کے لئے حکومت درانیہ کے خاتمہ کا ذمہ دار اسی سفاک کو قرار دیا ہے۔ کوئی شخص اس کے پاس جاکر اگر رپورٹ کرتا کہ ملک میں فلاں شخص صاحب دولت و ثروت ہے تو بلا وجہ اور بلا قصور اس کی جائداد ضبط کر کے داخل خزانہ سرکار کر لی جاتی اور اس کا کوئی عذر سمات نہیں ہوتا تھا۔ رحمہ شاہ صاحب قلندر کے ہاں خلق اللہ کی آمد و رفت شب و روز بکثرت رہتی تھی۔ رات دن لنگر خانہ چلتا رہتا تھا۔ جہاں ہزاروں کی تعداد میں روزانہ لوگ کھانا کھاتے تھے۔ مزید براں جو کچھ نذر و نیاز وہاں آتا تھا۔ وہ اپنے دست مبارک سے مسکینوں، یتیموں، محتاجوں میں تقسیم کرتے تھے اس لئے فیوض باطن کے علاوہ ان کی ظاہری فیاضی کا شہرہ بھی سارے ملک میں پھیل

گیا۔ اسی اثناء میں کسی ناعاقبت اندیش اور شریر الطبع نے طامع صوبیدار وقت کو اطلاع دی۔ کہ فلاں قلندر کے پاس دفینہ (خزانہ) ہے۔ جس کو وہ بے دریغ لوگوں میں تقسیم کر رہا ہے۔ یقیناً وہ کیمیا گر بھی ہے۔ صوبیدار کی حضوری میں دو سپاہی (ہیبت خان، امان علی خاں) ہر وقت حاضر رہا کرتے تھے۔ جو نہایت تند خو، مہیب، کریہ المنظر تھے۔ اور خاص طور پر سخت سے سخت مجرموں اور باغی ملزموں کی گرفتاری پر تعینات کئے جاتے تھے۔ صوبیدار نے ہیبت خاں کو حکم دیا کہ ''وہ فوراً موقع پر جا کر قلندر کو پابہ جولان حاضر دربار کرے۔ اور جو کچھ مال و دولت وہاں پایا جائے۔ وہ بلاکم و کاست داخل خزانہ شاہی کیا جائے''۔ الغرض مطابق حکم ہیبت خاں بکمال خشم و ہیبت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنا ارادہ ظاہر کرے قلندر صاحب کی ایک ہی نگاہ سے اس کے تمام بدن میں تھرتھری پیدا ہوئی۔ اور آتشین نگاہ کی ایک ہی جھلک سے اسکا موٹا بدن موم بتی کی طرح پگھلنے لگا یہاں تک کہ بیہوش ہو کر ان کے قدموں کے آگے زمین پر گر پڑا۔ جب اس واقعہ کی خبر صوبیدار کو ملی تو اس نے خشمناک ہو کر دوسرے سپاہی امان علی خان کو یہ مہم سر کرنے کیلئے بھیجا۔ اس کا بھی وہی حال ہوا۔ جو اس سے پہلے کا ہو چکا تھا۔ آخر ہوش سنبھال کر دونوں نے قلندر صاحب سے معافی مانگی۔ اور افعال شنیعہ سے تائب ہو کر ہمیشہ کے لئے ان کی قدمبوسی میں حاضر رہنے کا وعدہ کیا۔ یہ کیفیت جب صوبیدار کے کانوں تک پہنچی۔ تو اُس نے قلندر صاحب کی گرفتاری کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اور مزید کوئی کارروائی کرنے کی

جرأت نہ کی۔ قلندر صاحب نے بطور پیشن گوئی فرمایا کہ "اب حکومت دُرانیہ کا خاتمہ ہے"۔ یہ واقعہ ۱۲۳۳ھ ہجری کا ہے۔ چنانچہ ایک ہی سال کے بعد کشمیر میں حکومت درانیہ کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوگیا۔

ہیبت خاں اور امان علی خاں نے (جو بعد میں ہیبت شاہ اور مانہ شاہ کے نام سے مشہور ہوئے) باقی ایام زندگی قلندر صاحب ہی کے قدموں میں بسر کی اور وہ فیض باطنی سے بھی بہرہ ور ہوئے اپنے پیرومرشد سے چند سال پیشتر دونوں یکے بعد دیگرے وفات پا گئے۔ دونوں کی قبریں اسی باغ میں قلندر صاحب کی قبر کے ساتھ موجود ہیں۔



حضرت رحمہ شاہ صاحب قلندرؒ کے حالات و وفات اور حضرت سُلطانُ الفُقراء کی پیدائش

قلندر صاحب کے ہمعصر موضع صفاپور میں صاحب ورع وتقویٰ شیخ مخدوم بہاؤالدّین[1] صاحب تھے۔ جو اپنے عہد میں عام اجل اور شیخ اکمل گذرے ہیں۔ باغ جروگہ کے نیچے جھیل مانسبل کے کنارہ پر ان کا مکان تھا۔ جہاں ان کا مقبرہ اور مسجد اب تک موجود ہیں۔

قلندر صاحب کے ہاں شب و روز ساز و سرود اور وجد و سماع کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ شیخ صاحب اہل شرع و متقی ہونے کی وجہ سے اس طریقہ عمل کو ہمیشہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں دونوں بزرگوں کے درمیان دیر تک کشمکش رہی۔ اور وہ حالات آج تک زبان زدِ خاص و عام چلے آرہے ہیں۔ یہاں بخوف طوالت قلم انداز کیئے جاتے ہیں۔ قلندر صاحب (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) زیادہ تر فارسی میں ہی گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے تمام عمر بحالت تجرید وتفرید بسر کی۔ کشمیر و دیگر

---

[1] دیکھو مکمل تاریخ کشمیر اردو جلد سیوم صفحہ نمبر ۹۵ (مصنفہ منشی محمد الدین صاحب فوقؔ)

ممالک کے دور دراز مقامات سے طالبان راہ خدا اُن کی خدمت میں حاضر ہوکر حسب استطاعت فیضیاب ہوتے تھے۔

قلندر صاحب کا چھوٹا بھائی ''اعظم بٹ'' باوجود کثرت اشغال دنیوی ہر وقت حاضر خدمت ہوتا تھا۔ آخری سالوں میں ایک دن اس کو مخاطب ہوکر کے فرمایا کہ

''کل جولڑکا تمہارے گھر میں پیدا ہوا ہے۔ اس کو میرے پاس لاؤ۔''

چنانچہ وہ بچہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ قلندر صاحب نے اِس لختِ نور کو اپنی آغوش میں لیا۔ اور نہایت خوش ہوکر خدا کا ہزار ہزار شکر بجالائے۔ اور پھر اعظم بٹ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ

''اس لڑکے کی نہایت احتیاط و احترام سے پرورش کرو۔ یہ لڑکا کسی دن آسمان معرفت پر نیّر ہدایت بن کر چمکے گا اور اس کی نورانی کرنوں سے شرق و غرب منور ہو جائیگا۔ اس کا وجود اہل عالم خصوصاً باشندگان کشمیر کے لئے ابر رحمت بن کر آیا ہے۔ اپنے عہد میں سلطان الفقراء کے لقب سے مشہور ہوگا۔ شاہانِ وقت اس کی آستان بوسی کو فخر سمجھیں گے۔ عالم وجود میں آتے ہی اس کے لئے ظاہری حکومت میں بھی بہت بڑی تبدیلی ہونے والی ہے۔ جس کا عنقریب ظہور ہوگا۔ چونکہ یہ بستی اہل عالم کے لئے بطور آیۂ رحمت

ہے۔ اس لئے اس کا نام ''عبدالرحیمؒ'' رکھنا چاہئے۔ کاش میں بھی اس کی بہار دیکھتا''۔

پس مطابقِ ارشاد ان کا وہی نام رکھا گیا اور غیر معمولی حزم واحتیاط سے ان کی پرورش ہونے لگی۔ اس کے بعد قلندر صاحب صرف دو ہی سال قید حیات میں رہے۔ اس عرصہ میں ہر روز اس سعید لڑکے کو اپنے پاس بلواتے تھے۔ اور ماسوا شغل چھوڑ کر اسی کے شمع جمال کے پروانے بن کر کسی اور کی طرف توجہ نہیں فرماتے تھے۔ آخر جب ان کی رحلت کا وقت قریب ہوا تو اس وقت بھی خاص طور پر عبدالرحیم صاحبؒ کو اپنے پاس منگوایا۔ اور نہایت شوق سے پیار کرنے لگے۔ پھر تخلیہ میں اپنی چھوٹی ہمشیرہ کو کچھ پیغام دے کر فرمایا کہ

''جس وقت یہ لڑکا جوان ہوگا۔ تو اس کو میرا یہ پیغام معہ سلام پہنچانا۔''

انہی کلمات پر عبدالرحیمؒ صاحب کو ہمشیرہ صاحبہ کے سپرد کر کے خود عالم آخرت کو سدھارے۔ جناب رحمہ شاہ صاحب قلندر کا انتقال ۱۸۴۱ء مطابق سال ۱۲۵۷ھ میں بعہد صوبیداری شیخ غلام محی الدین واقعہ ہوا ہے۔ سال پیدائش تحقیق نہیں ہوا۔ مگر عمر شریف ۸۰۔۹۰ سال کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔ باغ جروگہ میں اپنے تکیہ کے سامنے (جہاں کچھ عرصہ پیشتر امان شاہ وہیبت شاہ دفن کئے گئے تھے) ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین کنج لحد ہو گئے۔

اِنَّا لِلّٰه وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

❀❀❀

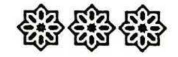
حضرت سُلطانُ الفُقر اء کا سال پیدائش اور آثار طفولیت

حضرت سُلطانُ الفُقر اء اپنے باپ کے تیسرے اور سب سے چھوٹے بیٹے ہیں۔ سب سے بڑا احسن بٹ اور اس سے چھوٹا وہاب بٹ اور اس سے سات سال بعد شروع موسم بہار میں ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۵ ہجری میں حضرت سُلطانُ الفُقر اء کا گلِ وجود جلوہ آرائے چمنستان عالم ہوا۔ تاریخ اور مہینہ کا پتہ نہیں چل سکا۔

ابھی ان کی عمر شریف پانچ سال سے زیادہ نہ تھی کہ ان کے والد ماجد اِس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ اس دُرِّ یتیم کی ظاہری تعلیم کا کسی نے خیال نہ کیا اور یہ اُمی رہے۔ مگر کسی کو کیا معلوم تھا۔ کہ کسی زمانہ میں اسی یتیم اور بظاہر بے علم شخص کے آگے بڑے بڑے علماء وفضلا زانوئے ادب تہہ کرینگے۔ اور اس کے دروازہ کی خاک کو اکسیر سے زیادہ وقعت ہو گی۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت سُلطانُ الفُقر اء نے باتیں کرنا شروع

کیں۔ تو اچانک کسی انسان یا درخت یا جانور کو دیکھ کر مدت تک حیران رہ جاتے تھے۔ اور دیر تک اسی چیز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے تھے۔ بعض اوقات اسی طرح آسمان سے نظر باندھتے تھے، جب تک کوئی شخص ان کو اس شغل سے منع نہ کرتا، اپنی توجہ کسی اور طرف نہ ہٹاتے۔ عام لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں نہایت کم شامل ہوتے تھے۔ ۹ سال کی عمر تھیں کہ مسجد کا راستہ لیا اور نماز کے آداب سیکھے اور اس عمر سے لیکر زندگی کے آخری لمحوں تک صوم و صلوٰۃ کے پابند رہے۔



حضرت سُلطانُ الفُقراء کی پیدائش کا اثر ملک پر

حضرت سُلطانُ الفُقراء کی ولادت باسعادت سے تقریباً ایک سو سال پیشتر اہل کشمیر ناقابل برداشت ظلم و ستم کا شکار ہو رہے تھے۔ ۱۱۴۴ھ میں خاتمہ حکومت چغتائیہ پر دور حکومت درّانیہ شروع ہوا۔ یہ انقلاب بدنصیب کشمیر کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہوا۔ آخر جب افغانیوں کے ظلم و ستم کا پیالہ لبریز ہو گیا۔ اہل کشمیر کے صبر و تحمل کی حد ہو چکی۔ ۶۶/ سال تک متواتر ظلم و ستم کی برداشت اور غیر ہمدرد و غیر ملکی شخصی حکومت کی ماتحتی نے جب اہل کشمیر کے اخلاق و عادات پر بھی ناگوار اثر ڈالا۔ تو اہل دل کے نالہ و فغاں کا شور عرش کی دیواروں سے ٹکرانے لگا۔ آخر احکم الحاکمین نے ۱۲۳۴ھ میں تخت کابل کے خوفناک قایم مقاموں سے کشمیر کو نجات بخشی اور یہاں حکومت خالصہ کا دور شروع ہوا۔ مگر سکھوں نے جو حصول علم و حسن عمل اور طرز حکومت غرض ہر بات سے کورے تھے۔ اہل کشمیر خصوصاً مسلمانوں کو بالکل برباد کر دیا۔ ۱۲۳۴ھ سے

۱۲۶۲ھ تک یعنی ۲۷ سال تک سکھوں کا کشمیر میں عمل رہا۔ مگر انہوں نے ۲۷ سال ہی میں ۶۶ سال کی کسر پوری کردی۔ درانیہ حکومت کے جتنے صوبیدار یہاں آئے۔ وہ بالاتفاق تباہی کشمیر کے ٹھیکہ دار تھے۔ یہی حال حکومت خالصہ کے صوبیداروں کا تھا۔ اس دور حکومت میں صرف ایک ہی صوبیدار کرنیل مہاں سنگھ کُمیدان تھا۔ جو رحم و انصاف کا فرشتہ بنکر کشمیر میں آیا تھا۔ اسی کے عہد حکومت کے پانچویں سال جناب حضرت سُلطانُ الفُقراء عالم وجود میں تشریف لائے۔ گو کرنیل صاحب کی حکومت اہل کشمیر کے لئے تمام و کمال بمنزلہ ابر رحمت تھی۔ مگر اس کی تمام نیک خواہشوں نے اسی سال میں عملی جامہ پہنا۔ اور جو جو تجاویز ملک کی بہتری کے لئے اور جو جو تمنائیں سرسبزی کشمیر کے متعلق اس کے نیک دل اور دادرس دماغ میں عرصہ سے خیالی صورت میں موجزن تھیں۔ وہ اسی سال میں پوری ہوئیں۔ جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ عرصہ دراز سے کارِ شالبافی (جس سے لاکھوں غریب اہل کشامرہ فیضیاب ہوتے تھے۔ اور خزانہ شاہی بھی معمور ہو جاتا تھا) بند پڑا تھا۔ اسی سال کرنیل صاحب کے فرمان سے پھر جاری ہوا۔ جس سے ایک حد تک فلاکت کشمیر دور ہوئی۔ اہل کشمیر خصوصاً باشندگان شہر غلہ کی کمیابی اور نایابی سے روز بروز تباہ ہوتے جاتے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ زمیندار بوجہ پریشان حال ہونے کے کما حقہ زرعات کو آباد نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر کہیں سے کچھ غلہ پیدا ہوتا بھی تھا۔ تو جابر اور ظالم عمال اس پر قبضہ کر لیتے تھے۔ غریب رعایا فاقہ کشی کا شکار ہی رہتی تھی۔ اس سال بیدار مغز اور رعایا پرور کرنیل صاحب کے حسن

انتظام سے زمینیں بھی خوب آباد ہوئیں۔ اور غلہ بھی عام فروخت ہونے لگا۔ جس سے ملک سرسبز وشاداب ہوگیا۔

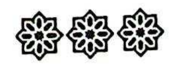
سب سے اہم اور قابل غور نکتہ ان کی پیدائش کا یہ ہے کہ اسی سال (یعنی ۱۸۳۹ء) میں شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ والیہ پنجاب کے انتقال نے چند ہی سالوں کے بعد (یعنی ۱۸۴۶ء میں) اس قسم کے سامان بہم پہنچائے۔ کہ حکومت خالصہ کا ظالمانہ دور ہمیشہ کے لئے کشمیر سے رخصت ہوگیا اور حکومت کشمیر کی زمام حقدار قدیم ڈوگرہ خاندان کے ہاتھ میں آئی اور حالات میں روز بروز بہتری کے آثار نظر آنے لگے۔ سُلطانُ الفُقراء کی پیدائش کے بعد سات سال تک کشمیر زیر حکومت خالصہ رہی۔ مگر اس عرصہ میں بھی کوئی ایسا ظالم وسفاک صوبیدار یہاں نہیں آیا۔ جو اہل کشامرہ کے امن وآسائش میں مخل ہوتا۔ کرنیل صاحب کے بعد دو ہی صوبیدار شیخ غلام محی الدّین اور شیخ امام الدّین یہاں آئے۔ یہ دونوں رعایا پرور اور انصاف پسند تھے۔ ان کا زمانہ بھی نہایت اچھا گذرا۔ ۱۸۴۶ء میں جبکہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کیا۔ اس وقت حضرت سُلطانُ الفُقراء کی عمر شریف سات سال کی تھی۔



حضرت سُلطانُ الفُقرا ءکی شالبافی اورزمینداری

قبل ازیں تذکرہ ہو چکا ہے کہ رحم دل کرنیل سنگھ کمیدان صوبیدار نے پیشہ شالبافی کو سال ۱۸۳۹ء میں یہاں دوبارہ رائج کر دیا۔ چند ہی دنوں میں کشمیر میں بیشمار کارخانہ جات شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ اکثر امیر لوگوں نے بڑے بڑے دیہات اور قصبہ جات میں شال بافی کے کئی کارخانے کھول دیئے۔ اور موضع صفاپور میں کسی متمول شخص نے ایک کارخانہ شروع کیا۔ جہاں تقریباً اڑہائی سو آدمی کام کرنے لگے حضرت سلطان الفقرا کے متعلقین نے ان کو بھی (جبکہ ان کی عمر دس سال کے قریب تھی) اسی کارخانہ میں کام کرنے کے لئے بھیجا۔ تقریباً پندرہ سال تک یہاں کام کرتے رہے۔ چونکہ ان کو بچپن ہی سے گانے بجانے کا شوق بھی دامنگیر تھا۔ اور وہ خود بھی نہایت خوش گلو تھے۔ کارخانہ کے چند ہم عمر لڑکے انہوں نے اس کام پر اپنے ساتھ تیار کر لئے تھے۔ چھوٹی عمر، باریک آواز اور آواز

پُرسرور و شیرین، ان سب باتوں سے کارخانہ کے در و دیوار رقص میں آجاتے تھے۔لیکن مالک کارخانہ، کام میں ہرج یا کسی اور وجہ سے، اس طریقہ کو ناپسند کرتا تھا۔ ایک دن حسب معمول جبکہ یہ جماعت اپنے شغل میں مست و مدہوش تھی۔ مالک کارخانہ آیا۔ اُس نے حضرت اقدس کو اس جماعت کا سرغنہ قرار دیکر ایک لاٹھی سے مارا جس سے ان کے جسم اطہر کو سخت تکلیف پہنچی۔مگر انہوں نے نہ صرف خاموشی سے برداشت کیا۔ بلکہ بخندہ پیشانی شکر باری ادا کرنے لگے۔اس پر مالک کارخانہ کو زیادہ غصہ آیا۔ اور ان کو اپنے کارخانہ سے رخصت کر دیا۔ حضرت سُلطانُ الفُقراء نے گھر آکر زمینداری کرنی شروع کی۔ابھی اس واقعہ کو چند ہی ایام گذرے تھے۔کہ فنِ شالبافی کو ضعف آیا۔اور تمام ملک میں یہ کارخانے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ جتنے بھی لوگ موضع صفاپورہ کے کارخانہ میں کام کرتے تھے۔سب زمینداری کرنے لگے۔



حضرت سُلطانُ الفُقر اءکی گھریلوزندگی

حضرت سُلطانُ الفُقر اء کے بھائیوں میں سے وہاب بٹ ابتدائے عمر میں ایک متصل گاؤں میں کسی زمیندار کے ہاں بطور خانہ داماد رہتا تھا۔ دوسرا بھائی حسن بٹ انتظام خانہ داری انجام دیتا تھا۔ کہ حکمت ایزدی سے عین عالم شباب میں وہ بیچارا ایک نابالغ لڑکا ''عبدالغفار'' چھوڑ کر اس جہان ناپائدار سے رخصت ہوگیا۔ اب سوائے حضرت اقدس کے گھر میں کوئی نہ تھا۔ متعلقین وغیرہ کی تحریک بلکہ فہمایش پر بروئے متابعت سنت نبویہؐ و بخیالِ کنبہ پروری آپ نے اپنی بیوہ بھاوجہ یعنی والدہ عبدالغفار سے نکاح کرلیا۔ اس نیک نہاد خاتون کے بطن سے حضرت اقدس کی چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ جن میں سے ایک بچپن میں ہی فوت ہوگئی جبکہ باقی تین اِسی گاؤں میں شریف اور معزز زمینداان کے گھروں میں بیاہی گئیں۔ ان کی اولاد از قسم اناث وذکور موجود ہے۔



ہمدردیٔ بنی نوع انسان کی بے نظیر مثال

۱۸۷۸ء مطابق ۱۲۹۵ھ میں جبکہ حضرت سُلطانُ الفُقراء کی عمر شریف ۳۹ سال کی تھی۔ خطۂ کشمیر میں سخت قحط پڑا جس سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ بوجہ گرسنگی موت کے گھاٹ اُترے۔ بیشمار خلقت ننگ و ناموس اور حب وطن کو خیر باد کہکر دور دراز ممالک میں چلی گئی۔ اکثر ماؤں نے اپنے پیارے بچے نہایت بیدردی سے راستوں پر چھوڑ دیئے جو کسمپرسی کی حالت میں پیک اجل سے ہم آغوش ہوگئے۔ لاتعداد لوگ غذا میسر نہ ہونے کے باعث عام راستوں اور گذرگاہوں پر تڑپ تڑپ کر جان دیتے تھے۔ کفن دفن تو ایک طرف لاشوں کو وہاں سے اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ یہاں تک کہ یہ لاشیں صحرائی درندوں اور کُتوں کے کام آتی تھیں۔ حضرت سلطان الفقرا کے گھر میں دودھ دینے والی دو چار گائیں موجود رہتی تھیں۔ حالت بھی خدا کے فضل سے اچھی تھی۔ قحط سے پہلے ہی ان کا طریقہ عام لوگوں اور مسافروں کو کھانا کھلانے کا تھا۔ ہر ایک چیز خدا کی راہ میں خیرات کرتے تھے۔ ایام قحط میں یہ طریقہ زیادہ مستحکم ہوا۔ عام مسافروں اور مسکینوں کو کھانا دینے سے جب فارغ ہوتے تھے۔ تو درختوں سے میوے اُتار اُتار کر بھوکوں کو کھلایا کرتے تھے۔ اس

عہد کے اکثر آدمی ابھی زندہ ہیں۔ جن کا بیان ہے کہ جب حضرت اقدس کسی درخت پر میوہ اُتارنے کے لئے چڑھ جاتے تھے۔ تو درخت کے نیچے بھوکوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہوتی تھی۔ چونکہ قحط کی شدت نے لوگوں کو اس قدر پامال کر دیا تھا۔ کہ کسی کو ایک میوہ دار درخت پر چڑھنے کی ہمت یا طاقت نہ رہی تھی۔ بخلاف اس کے خداوند کریم نے حضرت اقدس کو ایسی ہمت بخشی تھی کہ ایک دم بھی خدمت خلق اللہ سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ بندگانِ خدا کی تباہی اور سختی سے متاثر ہوکر زمانہ قحط میں سیر ہوکر کھانا بھی کبھی ان کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ مسکینوں اور بھوکوں کی سیر شکمی سے کسی قدر اطمینان اور فراغت حاصل کر کے گاؤں کے ارد گرد گشت کرتے تھے۔ ملاحظہ یا عام دریافت پر اگر کسی مردہ مسافر کی لاش مل جاتی تھی۔ تو فوراً اس لاش کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اپنے گھر لاتے تھے۔ اور اس کو غسل دیتے تھے۔ اور اگر لاش ننگی ہوتی تھی تو اپنا کوئی کپڑا کفن کے عوض استعمال کر کے بعد نماز جنازہ اپنے گھر کے متصل ایک جگہ دفن کر لیا کرتے تھے۔ اس کام میں بھی کسی دوسرے شخص نے ان کی معاونت نہیں کی۔ قبر میں داخل کرتے وقت ہر مسافر کے ساتھ وعدہ کرتے تھے۔ کہ انشاء اللہ المستعان اس دنیائے غدار سے کوچ ہونے پر میں بھی تمہارے ہی پہلو میں دائمی گوشہ نشینی اختیار کرونگا۔ اس قسم کے تقریباً ۲۵؍ مسافر انہوں نے اپنے دست مبارک سے سپرد زمین کئے۔ آخر جب اس دار فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوئے تو حسبِ وعدہ اسی قافلہ کے پڑوس میں شب آخرت بسر کرنے کے لئے جگہ حاصل کی۔

حق بہ حقدار رسید

وہ محترمہ امینہ خاتون (حضرت سلطان الفقرا کی پھوپھی صاحبہ) جس کو رحمہ شاہ صاحب قلندر نے پیغامبر بنایا تھا۔ شروع سے امورات خانہ داری سے دست کش اور نفیر تھی۔ رات دن عبادت و یادالٰہی اس کا کاروبار تھا۔ گفتگو بھی نہایت کم کرتی تھی۔ ابتداء میں اہلِ خانہ اِسے کام کاج کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ لیکن جب ان کو یقین ہو گیا کہ یہ عارفہ حقیقتاً دنیا سے بیزار و متنفر ہے تو انہوں نے بھی اسے تنگ کرنا چھوڑ دیا۔ اس کاملہ نے یاد الٰہی کے علاوہ عہد طفولیت میں حضرت اقدس کی پرورش کی۔ آخر جب حضرت ممدوح جوان ہوئے۔ اور امینہ کو بھی یقین ہو گیا کہ اب وہ امانت حقیقی برداشت کرنے کے قابل ہے تو اس نے حق پیغامبری ادا کر دیا یعنی رحمہ شاہ صاحب قلندر کا وہ پیغام ان کو سنا دیا جو انہوں نے اپنے بھائی اعظم بٹ اور اپنی ہمشیرہ یعنی حضرت سلطان الفقرا کی پھوپھی کو حضرتِ اقدس کے متعلق سنایا تھا۔ اس پیغام نے حضرت کے ساتھ برقی قوت کا کام کیا۔ اور ان چند لفظوں نے آپ کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

اس واقعہ کے چند ہی روز بعد ایک مست الست ہندی قلندر اچانک موضع صفاپور میں رونق بخش ہوئے۔ بغیر کسی سے کلام کرنے کے سیدھے سُلطانُ الفُقراء کے گھر گئے۔ حضرت اقدس اس وقت مسجد میں تھے۔ ایک نئے مہمان کی آمد کی خبر ہوئی۔ آئے اور ایک کمرہ میں ان کے ساتھ تنہا بیٹھ گئے۔ تخلیہ میں کیا کچھ ہوا، کس قسم کی باتیں تھیں، کیسے راز و نیاز تھے۔ کوئی شخص ان رموز و اسرار سے واقف نہیں ہوسکا۔ قلندر صاحب کے ہاتھوں میں دو کڑے اس قسم کے تھے جو لعل کی طرح چمک رہے تھے۔ رات بھر کمرے میں ان کڑوں کی روشنی رہی۔ حضرت سُلطانُ الفُقراء نے قلندر صاحب کی خوب خاطر داری کی۔ علی الصباح قلندر صاحب نے رخصت ہونے کے وقت ایک تسبیح سو (۱۰۰) دانہ کی حضرت اقدس کو پیش کی۔ قلندر صاحب یہاں سے رخصت ہوکر ایسے غائب ہوئے کہ کسی نے ان کو دوبارہ نہیں دیکھا۔ بعض اصحاب کا قول ہے کہ وہ صفاپور سے سیدھے حضرت بل (سرینگر) جہاں حضرت رسالتمآبؐ فداہ روحی کے موئے مبارک کی زیارت ہے) پہنچ گئے۔ اور دوسرے دن بادیہ پیمائے صحرائے بقا ہوئے۔ واللہ اعلم بالصواب!

حضرت اقدس کی پھوپھی صاحبہ نے بھی بعد انجام دہی فریضہ پیغام رسانی دو چار یوم کے اندر ہی عالم آخرت کا سفر کیا۔ ان کی تجہیز و تکفین کے ساتھ ہی حضرت اقدس امورات خانہ داری سے کلیتاً دست کش ہوگئے۔ اور ان پر مستی کی کیفیت ایسی طاری ہوئی۔ کہ دنیا داری کے لوازمات وضروریات کا جامہ یکدم چاک کرڈالا۔ یہ واقعہ ۱۲۹۶ھ کا ہے۔

رسول شاہ صاحب قلندر دُو رپش لار اور حضرت سُلطانُ الفُقر اء

اب حضرت سُلطانُ الفُقر اء زیادہ تر دشت و بیابان اور سنسان مقامات پر تنہا قیام پذیر ہونا پسند فرماتے تھے۔ لوگوں سے ان کو وحشت و نفرت تھی کسی سے ہم کلام بھی نہیں ہوتے تھے۔ لباس فاخرہ کی تو بات ہی نہیں۔ وہ اب خورد ونوش سے بھی آہستہ آہستہ دست بردار ہوتے جاتے تھے۔ اور گھر بھی بہت کم آیا کرتے تھے۔ بقول فوقؔ ؎

شہر والوں سے تو اک نفرت سی ہے
فوقؔ چل دیئے کسی کوہسار میں

صفا پور سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر اسی پرگنہ میں ''دُو رپش'' نامی ایک گاؤں آباد ہے۔ یہاں اُس زمانہ میں ایک مست اور فنا فی اللہ قلندر رسول شاہ صاحب موجود تھے۔ اپنے عہد میں فقیر سرمست اور مخمور بادۂ الست تھے ۱۳۱۸ھ میں جام بقا نوش فرما کر محبوب ازلی سے واصل ہوگئے۔ حضرت سلطان الفقرا کا ایک قریبی رشتہ دار عرصہ تک قلندر صاحب موصوف کی

خدمت میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن جبکہ وہ حسب معمول گھر سے روانہ ہوا تو اتفاقاً سرِ راہ حضرت اقدس ملاقی ہوئے۔ انہوں نے کوئی چیز دے کر فرمایا کہ یہ چیز قلندر صاحب کو دے دو اور میرا اسلام پہنچاو۔ آخر وہ شخص جب وہاں پہنچا تو خلاف معمول قلندر صاحب استقبال کو آئے۔ اور بلا اظہار وہ چیز بھی لے لی اور جواب سلام بھی ادا کیا اور کہا کہ واپس جا کر میری طرف سے بعد از سلام ادب سے عرض کرنا کہ اب وہ کہاں تک مجھے اپنے فراق میں بیتاب رکھیں گے۔ میں نے بارگاہ الٰہی میں بھی ان کی ملاقات کی دعا مانگی ہے۔ چونکہ یہ شخص عرصے سے وہاں جایا کرتا تھا۔ فیضِ ہم کلامی سے بہرہ یاب ہونا تو درکنار رہا۔ انہوں نے نیم نگاہ سے بھی کبھی اس کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ پس اس نے حیرانی کے ساتھ بکمال اضطراب و استعجاب یہ ماجرا حضرت اقدس کے گوشگذار کیا۔ الغرض اسی رات میں بہ اشارہ غیبی حضرت سلطان الفقرا قلندر صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ قلندر صاحب نے ان کو گود میں لے کر نہایت پیار کیا۔ اور محبت والفت سے پیش آ کر فرمایا کہ

> "یہ دنیا شرق سے لیکر غرب تک آپ ہی کی ہے۔ میں چندروزہ مہمان ہوں۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھ میں اب اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں آپ کے پاس آیا کروں۔ گاہ گاہ اپنے جمال جہاں آرا سے میری آنکھیں منور کیا کریں۔"

چند سال تک حضرت اقدس متواتر وہاں جایا کرتے تھے۔ اکثر تحفہ و تحائف بھی لیجاتے تھے۔ کئی باران کے لنگر خانہ کے لئے جنگل سے لکڑی

فراہم کر کے بہم پہنچائی۔ بلکہ ڈیڑھ سال کا کامل عرصہ موضع وُرپش کے باہر جنگل ہی میں گذار دیا۔

چونکہ قلندر صاحب کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ ہزاروں لوگ شہر و مفصلات سے وہاں آیا کرتے تھے۔ جب یہ شہرہ دربارِ کشمیر تک پہنچ گیا تو مہاراجہ رنبیر سنگھ آنجہانی والیے کشمیر جو اہلِ باطن اور فُقرا و اہل اللہ سے نہایت اُنس رکھتے تھے، بہ نفس نفیس قلندر صاحب کی زیارت کیلئے وہاں تشریف لے گئے اور مہاراجہ صاحب ممدوح نے وہاں کے اخراجات کو محسوس کر کے کچھ وظیفہ ماہوار اور کچھ جاگیر لنگر کے لئے مقرر فرمادی۔ اس ماجرا سے حضرت سلطان الفقرا کشیدہ خاطر ہو کر وہاں سے ہمیشہ کے لئے اپنے مولد و مسکن پر (صفاپور) چلے آئے اور فرمایا کہ "اب یہ فقیر خانہ نہیں رہا بلکہ۔ مندر ہے" پھر وہاں جانے کی کبھی خواہش نہ فرمائی۔

اگرچہ سُلطانُ الفُقرا مستی کی حالت میں تھے۔ اور انہوں نے اسی حالت میں ایک زمانہ ایک مست الست قلندر کی صحبت میں بسر کیا تاہم انہوں نے جادۂ شریعت سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا۔ کبھی عریاں نہیں رہے۔ اور خلاف شرع کوئی فعل نہیں کیا۔ اور زبان مبارک کو کسی مذموم اور نازیبا لفظ سے آلودہ نہ فرمایا۔ حتیٰ کہ ادائے صلوٰۃ سے بھی غافل نہ رہے۔ اگرچہ ان کی نماز نمازِ مستانہ ہی ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جب وضو کرنا شروع کرتے تھے تو ایک ایک عضو مبارک کو دس دس بار دھوتے تھے۔ وضو سے فارغ ہو کر جب کسی مقام پر نماز ادا کرنے کے لئے جاتے تھے۔ تو اکثر اوقات نماز شروع

کرنے سے پہلے پھر دریا پر جا کر نیا وضو کرتے تھے اور نماز بھی بے حساب ہوا کرتی تھی۔ ایک ہی وقت میں لاتعداد رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔ اور ایک ایک سجدہ دو دو گھنٹوں میں ادا ہوتا تھا۔ اسی طرح نماز کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ بسا اوقات وحوش وطیور اور مرغوں کی آواز سنکر نماز شروع کر دیتے تھے۔

صفاپور سے سرینگر تک سترہ میل کا فاصلہ ہے۔ ایک دن صبح کے وقت حضرت سُلطانُ الفُقراء گاؤں کی آبادی سے باہر جھیل مانسبل کے کنارے پر نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص بوقت آٹھ بجے صبح ان کے نزدیک سے ہوکر روانہ سرینگر ہوا۔ یہ شخص بحالتِ مجبوری ۳۴ میل طے کر کے سرینگر سے صفاپور واپس آیا۔ شام کے قریب دیکھا کہ حضرت سلطان الفقرا بدستور اسی صبح کے مقام پر مشغول نماز ہیں۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت اقدس صبح سے مسلسل نماز ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات شام سے صبح تک بدستور مشغول نماز رہا کرتے تھے۔

عجباً نمازِ مستان تو بگو درست ہست آن
کہ نداند او زمانے نشناسد او مکانے
عجباً دو رکعت است این عجباً چہارم است این
عجباً چہ سورہ خواندم چو نداشتم زبانے
بہ خدا خبر ندارم چو نماز مے گذارم
کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے

حضرت سُلطانُ الفقراءکی سیر وسیاحت

وُرپش سے واپس آکر حضرت سُلطانُ الفُقراء چند یوم اپنے گھر مقیم رہے۔ اسی اثناء میں ایک دن جبکہ حضرت اقدس تنہا کمرے میں محو ومستغرق بیٹھے تھے کہ اچانک عین دوپہر کے وقت مکان سے آگ کا شعلہ مشتعل ہوا۔ دیکھتے دیکھتے آگ نے سالم مکان کو گھیر لیا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں آگ بجھانے کو دوڑ رہے تھے۔ مگر حضرت اقدس اپنی جگہ سے متحرک نہ ہوئے۔ ہر چند لوگ باہر نکلنے کے واسطے بہت کچھ کہہ رہے تھے۔ مگر یہاں جواب تک نہیں ملتا تھا۔ آخر جب آگ بالکل نزدیک پہنچ گئی۔ تو اُن کے برادر زادہ ''عبدالغفار صاحب'' نے (جو اُن دنوں قوی الجثہ جوان تھے) ان کو زبردستی وہاں سے گود میں اُٹھا لیا۔ اور مکان سے دور ایک درخت کے نیچے بٹھایا۔ مکان کے بچاؤ کے لئے بہت کچھ تدبیریں کی گئی تھیں۔ مگر آگ نے مکان کا چپہ چپہ اپنی لپیٹ میں لیا۔ یہ معلوم کرنا نہایت مشکل ہو گیا کہ آیا یہ آگ ابتداءً کہاں سے نمودار ہوئی تھی۔

یہ زمانہ بھی کسی قدر نیم سکھا شاہی زمانہ تھا۔ ملازمان دیہی کی

رپورٹ آتش ناگہانی پر تیسرے دن سرینگر کے محکمہ وزارت (ضلع) سے باشندگان دیہہ اور مکاندار کی حاضری کا حکم آیا۔ باشندگان دیہہ جب جانے پر تیار ہوئے۔ تو انہوں نے عبدالغفار صاحب کو اپنے ساتھ کر دیا۔ اس نے واقعہ بیان کر کے حضرت اقدس سے اجازت مانگی۔ انہوں نے فرمایا کہ ''اچھا جاؤ تم سے کوئی نہیں پوچھے گا۔ میں آج رات کے وقت ایسی آواز دونگا۔ کہ زمین کا تختہ ہل جائیگا''۔ الغرض عبدالغفار صاحب معہ چند باشندگان صفاپور سرینگر گئے۔ دوسرے دن اُنکو کچہری میں پیش ہونا تھا۔ مگر اسی رات میں ۲ بجے کے قریب جبکہ تمام خلقت خواب راحت میں پڑی ہوئی تھی۔ ایسا سخت اور خوفناک زلزلہ واقع ہوا۔ کہ کرہ زمین گہوارہ کی طرح ہل گیا۔ اور طبقہ ارض سنگ آسیا کی طرح چکر میں آیا۔ جس سے ہزاروں مکانات گر کر سطح زمین کے ساتھ ہموار ہو گئے۔ اور بیشمار خلقت پہلے ہی حملہ میں نذر اجل ہو گئی۔ گو اس زلزلہ نے شہر و دیہات پر یکساں حملہ کیا تھا۔ مگر سرینگر کی آبادی ذرا گنجان ہے۔ اسلئے یہاں وہ کیفیت ہوئی کہ لوگوں کو یقین ہو گیا کہ بس یہی قیامت ہے۔ وحوش وطیور اور چرند و پرند اپنے اپنے مقامات و آشیانے چھوڑ کر کھلے میدان میں بھاگ گئے۔ زلزلہ نے حسب معمول ایک ہی وار پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ پے در پے حملے ہوتے رہے۔ غرض صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پہلے ہی تمام لوگ گھر بار اور اثاث البیت چھوڑ کر کھلے میدانوں میں ڈیرہ افگن ہو گئے۔ اور حکام بھی عالیشان کوٹھیاں اور نفیس بنگلے چھوڑ کر دشت و باغات میں خیمہ جات کی آڑ میں جان بچاتے رہے۔

عبدالغفار صاحب اور اس کے ساتھیوں کو جب معلوم ہوا کہ خواص و عوام اور حکام نفسی نفسی میں پڑے ہوئے ہیں تو بلا کسی روک تھام کے گھر چلے آئے۔ بعد میں ان کو کسی نے کوئی تکلیف نہ دی۔ اور نہ واپس چلے آنے کا کسی نے جواب طلب کیا۔

ان زلزلوں کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا۔ عام کاروباری حالت میں رکاوٹیں پیدا ہوگئیں۔ علاقہ بارہ مولہ میں ایک گاؤں موضع "لرہ ڈورو" زمین میں دھنس گیا۔ یہ واقعہ ۱۳۰۲ھ کا ہے۔

چونکہ بوجہ صدمات زلزلہ حضرت سُلطانُ الفُقراء کا مکان تیار نہ ہوسکا۔ اس لئے انہوں نے ایک صندوق چوبین کے نیچے (جس کی چھت زمین سے تین فٹ اونچی تھی) چھ ماہ کا عرصہ ایک ہی طرز پر بسر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ آپ بالکل اشیاءِ خورد و نوش سے بھی دست بردار ہوگئے تھے۔ صرف چوبیس گھنٹے کے کامل صوم کے بعد کسی قدر چاول کے دھوئے ہوئے گرم پانی سے افطار فرماتے تھے اور کسی کے ساتھ بات چیت بھی نہیں کرتے تھے۔ کامل چھ ماہ کے بعد یہاں سے نکل کر گھر کے نزدیک ہی ایک درخت چنار کے کھوکھلے شکم میں اسی طرح بحالت صوم ایک سال کا عرصہ بسر کیا۔ اس کے بعد وہاں سے اُٹھ کر بخیالِ سیاحت بطرف سرینگر تشریف فرما ہوئے۔ ہر چند بعض محبوں نے ہمراہ جانا چاہا۔ مگر انہوں نے منظور نہیں کیا اور بحالت تنہائی عازم سفر ہوئے۔ افسوس ہے کہ مفصل حالات سفر تحقیق نہیں ہوسکے۔ صرف اس قدر معلوم ہے کہ موضع "اچھہ کوٹ" تحصیل سرینگر پرتاب سنگپورہ

میں پہنچ کر کچھ عرسہ حضرت سید محمد صاحب کرمانیؒ کے مزار مقدس پر گوشہ نشین رہے۔ یہاں بھی صوم بدستور رہا۔ لوگ انواع و اقسام کے اشیاء خورد و نوش پیش کرتے تھے۔ مگر انہوں نے برنج آب (چاول کے پانی) پر کسی چیز کو ترجیح نہ دی۔ کچھ عرصہ کے بعد مقامات ذیل۔ خانصاحب[1] ملک[2] چاڈورہ قصبہ ناگام[3]، چرار شریف[4]، پکھر پورہ[5]، دربہ گام[6] راہموہ[7] ہانجی گنڈ[8] کی سیر کر کے ڈیڑھ سال کے سفر کے بعد پھر رونق افزائے قریہ صفاپور ہوئے۔

---

۱ یہ گاؤں سرینگر سے ۲۲ میل کے فاصلہ پر جانب غرب واقع ہے یہاں حضرت صالح خاں صاحب کی زیارت ہے جو اپنے عہد میں بوضع قلندرانہ ولی اکمل تھے۔ گاؤں انہی کے نام پر آباد ہوا ہے۔ زیارت مرجع خاص و عام ہے۔ ۴ ماہ ساون کشمیری کو یہاں دھوم دھام سے میلہ ہوتا ہے۔ میلہ سے چار یوم پیشتر خانصاحب موصوف کا عرس بھی منایا جاتا ہے۔

۲ یہ گاؤں سرینگر سے ۱۰ ار میل کے فاصلہ پر جانب جنوب واقع ہے۔ مشہور مورخ کشمیر حیدر ملک یہیں کا باشندہ تھا۔

۳ ملک چاڈورہ سے ایک میل پر جانب جنوب واقعہ ہے۔ مشہور اور تاریخی قصبہ ہے۔ پرگنہ کا صدر مقام ہے۔

۴ یہ قصبہ قصبہ ناگام سے ۵ میل کے فاصلہ پر جانب جنوب ایک بلندی پر واقعہ ہے۔ یہاں اولیاء کشمیر کے تاجدار سر حلقہ ریشیان ولی اکمل شیخ نور الدین صاحب نورانیؒ کا مرقد مقدس ہے قصبہ بارونق ہے اور قصبہ جات کشمیر میں دوسرا درجہ رکھتا ہے۔

۵ یہ گاؤں چرار شریف سے ۵ میل کے فاصلہ پر جنوباً جنگل میں واقع ہے۔ یہاں سید عالی صاحب بلخیؒ کا مزار پر انوار ہے۔

۶ و ۷ یہ دونوں گاؤں مشہور نالہ ''راموشی'' کے دونوں کناروں پر آباد ہیں مقامات فرحت افزا اور تاریخی ہیں۔

۸ یہ گاؤں مک چاڈورہ سے ایک میل نیچے جانب سرینگر آباد ہے کشمیر کے مشہور بھگت (بھانڈ) یہیں کے رہنے والے ہیں۔ یہ بھگت سلطان الفقرا کے سالانہ عرس پر مجرا بھی کیا کرتے تھے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ آنحضور نے دیہات صدر کے علاوہ بھی اس سفر میں اکثر مقامات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے منور فرمایا ہے۔ لیکن وہ تمام حالات دائرہ عافیت سے باہر ہے۔

کچھ عرصہ اپنے مسکن پر قیام پذیر ہو کر آنجناب نے پھر سیاحت کا عزم فرمایا اس دفعہ بھی تنہا تشریف لے گئے۔ اَب کے خصوصیت سے زینت بخش علاقہ ''کامراج'' ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ اس سفر کے حالات بھی پردہ اخفا میں رہے البتہ اس قدر معلوم ہوا کہ علاقہ ''لولاب کے ایک درخت چنار کے بطن میں، گنج معرفت چھ ماہ تک پوشیدہ رہا۔ اس سفر میں بھی حضرت اقدس ڈیڑھ سال تک مصروف سیاحت رہے۔ اس کے بعد صفاپور آکر ہمیشہ کے لئے عزلت نشین ہوگئے۔ اور پھر کبھی سیر و سیاحت کا ارادہ نہ فرمایا۔ حیات مجازی کے بقیہ ایام ایک تنگ و تاریک کمرہ میں بسر فرمائے۔ البتہ اب سیر کوہسار کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے حالات آگے بعنوانِ ''حضرت سلطان الفقراء اور کوہِ ہلدر'' میں بالتفصیل درج ہیں۔



حضرت سُلطانُ الفُقرا ءاور کوہِ ہلدر

صفا پور کی آبادی سے سوا میل کے فاصلہ پر بطرفِ مشرق جھیل مانسبل کے دامن کے ساتھ جو اونچا اور ننگا پہاڑ ہے۔ اس کا نام ہلدر ہے۔ اس کی چوٹی کے مشرقی وشمالی پہلو میں جنگلی درخت بکثرت موجود ہیں۔ جنوبی وغربی پہلو میں سوائے چند درختان اخروٹ کے نخل واشجار کا کہیں نام ونشان بھی نہیں۔ یہ درخت بھی کسی کے نصب کردہ نہیں بلکہ خودرو ہیں۔ اور نہ ہی ان پر کسی کا قبضہ ہے۔ یہ جگہ ''ریشی ونی'' کے نام سے مشہور ہے۔ عوام میں اس مقام کے درختوں کی نسبت بہت سی عجیب وغریب روایتیں مشہور ہیں۔ جو عرصہ سے زبانی چلی آتی ہیں۔ اس بناء پر کوئی شخص ان درختوں پر قبضہ کرنے یا انکے پھل کو خانگی استعمال میں لانے کی جرأت نہیں کرتا۔ البتہ وہاں جا کر میوہ کھا سکتا ہے۔

اس پہاڑ کی بلندی کنار جھیل مانسبل سے چار پانچ میل کے برابر ہے۔ چوٹی سے تمام وادئ کشمیر کا دل پسند نظارہ خصوصاً دریائے جہلم کی پیچدار روانی جھیل مانسبل اور جھیل وُلر کا عجیب منظر نہایت دلفریب نظر آتا

ہے۔ موسم گرما میں اس پر موذی جانور سانپ، بچھو، دومونہہ، بکثرت ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کی آمدورفت اس پہاڑ پر نہایت کم رہتی ہے۔ صرف بعض چرواہے اس پر بکریاں وغیرہ لے کر جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی متنفس وہاں نظر نہیں آتا۔

سیاحت کے اختتام اور عُزلت نشینی کے آغاز پر حضرت سلطان الفقراء نے کوہ ہلدر پر چڑھنا شروع کیا۔ علی الصباح اپنے خلوت کدے سے نکل کر بغیر کسی رفاقت کے پہاڑ پر جایا کرتے تھے۔ کبھی کسی خادم یا محبّ کو دامن کوہ سے اوپر ساتھ چلنے کی اجازت نہ بخشی۔ ہمیشہ شام کے قریب پہاڑ سے واپس آکر سیدھے اپنے خلوت خانہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ دو چار دفعہ رات کو بھی پہاڑ پر قیام فرمایا ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی تک جانے کا کوئی خاص یا آسان راستہ مقرر نہیں۔ جہاں سے انسان چڑھنا چاہے۔ اکثر دشوار گذار اور خطرناک مقامات پیش آتے ہیں۔ پاؤں پھسل جانے پر جانبر ہونا مشکل ہے۔ حضرت اقدس نے بھی زمانہ سیر کوہسار میں آمدورفت کا کوئی خاص راستہ مقرر نہیں فرمایا تھا۔ اور راستہ کی دشواری و سختی کبھی ان کے ارادہ کو مانع نہ ہوئی۔ ہر حالت اور ہر موسم میں وہ اس پہاڑ پر یکساں آمدورفت کر سکتے تھے۔ خصوصاً آخری ایام میں جبکہ ان کی حیات صوری نے ستر (۷۰) منزلیں طے کر لی تھیں۔ بلا وقت ایک نوجوان کی طرح چل سکتے تھے۔ اس سیر کی آمدورفت کا کوئی خاص وقت یا کوئی خاص دن یا تاریخ مقرر نہیں تھا۔ ابتدائی ایام میں ہر روز بلاناغہ صبح کے وقت تشریف لے جا کر شام

کے مختلف اوقات میں واپس جلوہ نما ہوتے تھے۔ لیکن آخری ایام میں ہر روز کی قید نہیں رہی۔ اور صرف ان ایام میں جبکہ خلوت کدہ کا دروازہ (اس کی مفصل کیفیت آئندہ درج ہے) بند فرمادیتے تھے، سیر کوہسار ملتوی رہتا تھا۔ حضرت اقدس آخر عمر تک (تقریباً پچیس سال) پہاڑ ہلدر پر جاتے رہے۔ مگر کسی طرح بھی اس راز کا انکشاف صاف الفاظ میں نہیں ہوا کہ آیا مدعائے سیر کیا تھا۔ اور دن بھر وہاں ان کا شغل کیا رہتا تھا۔ گوان کے مخلصان ومعتقدان اس سیر کی علت غائی پر گونا گون خیالات وروایات اس وقت بھی بیان کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اجتماع سے کوئی خاص نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ بعض چرواہوں کا بیان ہے کہ کوہ ہلدر کی بلند چوٹی پر ایک بہت بڑا مستطیل پتھر ہے۔ انہوں نے اتفاقاً آنحضور کو بارہا اس پتھر پر جلوہ افروز پایا ہے۔ چند ایک محبانِ خاص اور عاشقان جان نثار اس کوہسار پر دیدار کے لئے چڑھے تھے۔ شام تک گھوم کر ناکامیاب واپس آئے۔ ایک دو کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت اقدس کو چوٹی کے مستطیل پتھر پر دیکھا۔ لیکن آنحضور نے زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی۔

حضرت سُلطانُ الفُقراء کے خلیفہ خاص اور منظور نظر حضرت پیر غیاثؒ الدّین شاہ صاحب مدظلہ العالی ایک دفعہ حضرت اقدس کے ساتھ اس پہاڑ پر گئے ہیں انہوں نے جو کچھ ظاہر فرمایا۔ وہ بعینہ درج ذیل ہے۔

ایک دن شام کے وقت کھانا کھانے کے بغیر ہی شاہ صاحب سرینگر سے روانہ صفاپور ہو کر صبح کے وقت حضرت اقدس کے دیدار سے فیضیاب

ہوئے۔ آنحضور سیر کوہسار پر تیار تھے۔ یہ بھی ان کے ہمراہ چلے گئے چونکہ آنجناب کو شاہ صاحب کی خاطر منظور تھی۔ اس لئے ساتھ آنے سے منع نہ کیا۔ چند میل کی چڑہائی طے کر کے ان کو بھوک کی شدت محسوس ہوئی۔ کیونکہ وہ سرینگر سے بھوکے آئے تھے۔ اور اُوپر سے دھوپ کی شدت بھی پورے زور پر تھی۔ شاہ صاحب کے دل میں اس خیال کے پیدا ہوتے ہی حضرت سُلطانُ الفُقرا ء ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ اس مقام کے بائیں طرف ایک نالہ تھا۔ اس نالہ کے ایک درخت کی طرف انگشت مبارک سے اشارہ کر کے فرمایا کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کیا درخت ہے۔ شاہ صاحب نے بغور دیکھ کر عرض کیا کہ: ''غالباً انگور کا درخت ہوگا''۔ فرمایا کہ ''جا کر دیکھ لو کہ آیا اس پر کوئی انگور کا گُچھا تو نہیں ہے۔'' مطابق حکم نالہ کی اترائی طے کر کے جب اس درخت کے ذرا نزدیک پہنچ گئے۔ دیکھا کہ اس کی جڑ کے ساتھ دو قوی الجثہ سانپ ایک دوسرے سے ایک فٹ کی مسافت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں خوفناک آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ گھبرا کر واپس آئے۔ اور ماجرا گوشگذار کیا۔ آپ نے فرمایا:

''جاؤ گھبراؤ مت۔ تمہیں وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ دونوں میرا ہی کلمہ پڑھتے ہیں۔''

چونکہ سانپوں کی ایک ہی نظر نے شاہ صاحب کے حواس باختہ کر دیئے تھے۔ اس لئے انہوں نے دوبارہ درخت کے نزدیک جانے کی جُرات نہ کی۔ آخر ان کے دہشت و خوف کو دیکھ کر حضرت اقدس یہ نفس نفیس اس درخت کی

طرف تشریف لے گئے۔ ہر چند شاہ صاحب نے ان کو روکا۔ مگر وہ نہ رُکے۔ درخت کے نزدیک جا کر ان سانپوں کے درمیان ٹھہر گئے۔ اور اپنی چھڑی کے اشارے سے دونوں سانپوں کو وہاں سے بھاگ جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ وہ دونوں بھاگ گئے۔ درخت کے آس پاس ایک اور قسم کے کالے سانپ بھی (جنکو کشمیری زبان میں گُنس کہتے ہیں) بکثرت موجود تھے۔ ان کو حضرت اقدس نے چھڑی سے ٹھیکریوں کی طرح ادھر اُدھر پھینک دیا۔ یہاں تک کہ جگہ صاف ہوگئی۔ سانپوں کے ہٹائے جانے کے بعد شاہ صاحب حضرت اقدس کے اشارے سے درخت پر چڑھ گئے۔ اس پر صرف پانچ ہی گچھے سیاہ انگور کے موجود تھے۔ حضرت اقدس نے ان کو انگور کھانے کا حکم دیا۔ اگرچہ وہ چاہتے تھے کہ آنحضور بھی چند دانے تناول فرمایں مگر انہوں نے منظور نہ فرمایا۔ شاہ صاحب کی گرسنگی دو ہی گچھوں سے دور ہوگئی۔ تین موجود رہے۔ اس کے بعد پھر بالاتفاق کوہ ہلدر پر چڑھنا شروع کیا۔ چند قدم کے فاصلہ پر اوپر سے ایک مست الست فقیر اُترتا ہوا ملا جس کے بدن پر سوائے ایک زرد رنگ قمیض اور تہمت کے اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس کے سر کے بال نہایت لمبے سیاہ اور چمکیلے تھے۔ نہایت شوق اور تپاک سے حضرت اقدس سے ہاتھ ملایا۔ اور آپس میں ہمکلام ہوئے۔ لیکن یہ گفتگو کشمیری زبان کے سوا کسی اور زبان میں تھی۔ جس کو شاہ صاحب نہ سمجھ سکے۔ اسی نوع پر باتیں کرتے کرتے یہ فقیر بھی واپس پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ تینوں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ایک مستطیل اور مسطح پتھر پر متمکن ہو گئے۔ باتوں باتوں میں دن غروب ہو گیا۔ شاہ صاحب

نے سمجھ لیا کہ آج صفا پور واپس جانا نصیب نہیں ہوگا۔ انہوں نے اس مست قلندر سے دریافت کیا کہ آپ کس جگہ فروکش (رہائش پذیر) ہیں۔ اُس نے ایک ویران وسنسان اور دور دراز جنگل کی طرف (جہاں آبادی کا نام ونشان نہ تھا) اشارہ کیا۔ شاہ صاحب نے پوچھا کہ کیا آپ کے ڈیرے پر ہمارے آج یہاں ٹھہرنے کی اطلاع ہے یا نہیں؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ آخر آٹھ بجے شب کے قریب دو اجنبی وضع کے آدمی خوان لے کر حاضر ہوئے۔ دونوں بزرگوں کی تحریک سے شاہ صاحب نے حسب ضرورت کھانا کھایا۔ ان کا بیان ہے کہ میں تشریح نہیں کرسکتا کہ آیا وہ کس قسم کا کھانا تھا۔ اور کونسی چیز پکائی گئی تھی۔ کیونکہ میں نے اپنی عمر اس نوع کا کھانا کبھی دیکھا نہیں ہے۔ خوان بردار چپ چاپ واپس چلے گئے اُدھر شاہ صاحب پر نیند نے غلبہ کیا۔ اور وہ سو گئے۔ صبح کے وقت ان کی بیداری پر حضرت اقدس عازمِ صفا پور ہوئے۔ اور ایک دوسرے راستہ سے اُترنا شروع کیا۔ کسی قدر فاصلہ پر آکر قلندر صاحب کو رخصت دیدی۔ اور وہ واپس قلۂ کوہ پر چلے گئے۔ شاہ صاحب نے اثناءِ راہ میں حضرت سُلطانُ الفُقراء سے عرض کیا ”یہ قلندر کس قدر عرصہ سے اس سنسان جنگل میں سکونت پذیر ہے؟“

انہوں نے فرمایا: ”بتیس برس سے!“

جناب پیر غیاث صاحب نے پھر عرض کیا: ”وہ کھانا کہاں سے لاتے ہیں اور کیا کھاتے ہیں؟“

حضرت اقدس نے فرمایا: ”کچھ بھی نہیں!“

جناب پیر غیاث صاحب نے پھر عرض کیا: ''کیا یہ پھر ''مُلک'' ہیں؟''
حضرت اقدس نے فرمایا: ''ان سے بدر جہا بڑھ کر!''
جناب پیر غیاث صاحب نے پھر عرض کیا کہ ''کیا یہ فقیر کامل ہیں؟''
حضرت اقدس نے فرمایا: ''نہیں، ابھی اس درجہ پر نہیں پہنچے۔''
اَلْفَقَرُ اِذَا تُمَّ فَھُو اللہ۔

اولیا را بر مَلک باشد شرف
پس چہ جائے دیگر است اے خلف
در صور انسان ولے در عشقِ حق
از ملایک بردہ منزلہا سبق

خُدام کا بیان ہے کہ رحلت سے ایک دو سال پیشتر حضرت سلطان الفقرا نے ایک دن دروازہ بند فرماتے وقت ہدایت فرمائی کہ ۹/دن تک اس دروازہ کو مت کھولنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نویں دن جب دروازہ کھلا تو دیکھا گیا کہ حضرت اقدس نہایت علیل اور کمزور ہو گئے ہیں۔ اور جسم اطہر عرق آلود ہے۔ پھر کسی قدر گرم پانی نوش فرما کر زبان معرفت بیان سے یوں گوہر بار ہوئے۔ کہ اس پہاڑ (ہلدر) پر ہمارا ایک رفیق رہتا تھا۔ جس کا ایک دور ملک میں انتقال ہو گیا ہے۔ میں اسکی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر آج آیا ہوں، چنانچہ اس واقعہ کے بعد حضرت اقدس کوہ ہلدر پر نہایت کم تشریف لے جایا کرتے تھے۔

باشندگان علاقہ ہذا ظاہر کرتے ہیں کہ کوہ ہلدر کی چوٹی پر عرصہ دراز سے رات کے وقت ہمیشہ ایک ہی مقام پر روشنی ہوا کرتی تھی بعض لوگ اس بات کو دیو دغول کے نشانات تصور کر کے تعجب سے دیکھا کرتے تھے مگر اب چند سال سے یہ روشنی مفقود ہے۔

جناب رسول شاہ صاحب قلندر لاری (جن کا ذکر پہلے آچکا ہے) حضرت سُلطانُ الفُقراء کو ''موسیٰؑ'' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ چنانچہ آخری سالوں میں جس قدر اہل حاجات یا اہل در دِ محبت تحفہ و تحائف لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کو صاف حکم دیتے تھے کہ جاؤ 'موسیٰ' کے دربار میں حاضر ہو جاؤ۔ قلندر صاحب نے یہ لقب باعتبار سیر کوہسار تجویز فرمایا تھا۔

مختصر یہ کہ حضرت سُلطانُ الفُقراء کے کوہ ہلدر پر جانے کی اصلیت اور وہاں کے اسرار کو سوائے ان کی ذات مقدس کے کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہاں پر دلائل عقلیہ اور روایات نقلیہ سے کام لیکر خامہ فرسائی کرنا بالکل بے سود ہے۔

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام
پس سخن کوتاہ باید والسلام



حضرت سُلطانُ الفُقراءؒ کی وفات اور تعمیرِ مقبرہ

خطۂ کشمیر میں جس قدر اولیائے کبار اور مشائخان نامدار گذرے ہیں۔ان کے مزارات مقدس نہایت شاندار اور پُر تکلف موجود ہیں۔ خصوصاً سرخیل ریشیان کشمیر سید التارکین جناب حضرت شیخ نورالدین نورانی علمدار کشمیرؒ اور سلطان العارفین جناب حضرت شیخ حمزہ مخدومی کشمیریؒ جن کے کمالات اور کشف و کرامات محتاج بیان نہیں۔اور جن کے کلام کو اہل کشامرہ حدیث نبویہ کے بعد درجہ دیتے ہیں، کے مزارات فیض آیات ایسے عالی شان بنے ہوئے ہیں کہ ان کی تعمیر اور زرکاری۔ نقش و نگار اور پردہ ہائے طلاکار پر لاکھوں روپے صرف ہوگئے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بادشاہوں کے انتظام سے ایسے تعمیرات کا تیار ہونا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ تاریخ سے پایا جاتا ہے کہ یہ مزاراتِ پُر انوار ان حضرات عالی درجات کے وصال حقیقی کے بعد تعمیر ہوئے ہیں۔ کسی شیخ وقت یا صوفی عہد نے اپنی حیات مجازی میں اپنا مقبرہ تعمیر نہیں کرایا۔ بخلاف اس کے جناب تاج الاولیا سلطان الفقرا نے انتقال سے کچھ عرصہ پیشتر اپنا مقبرہ تعمیر کرایا۔ جس کی

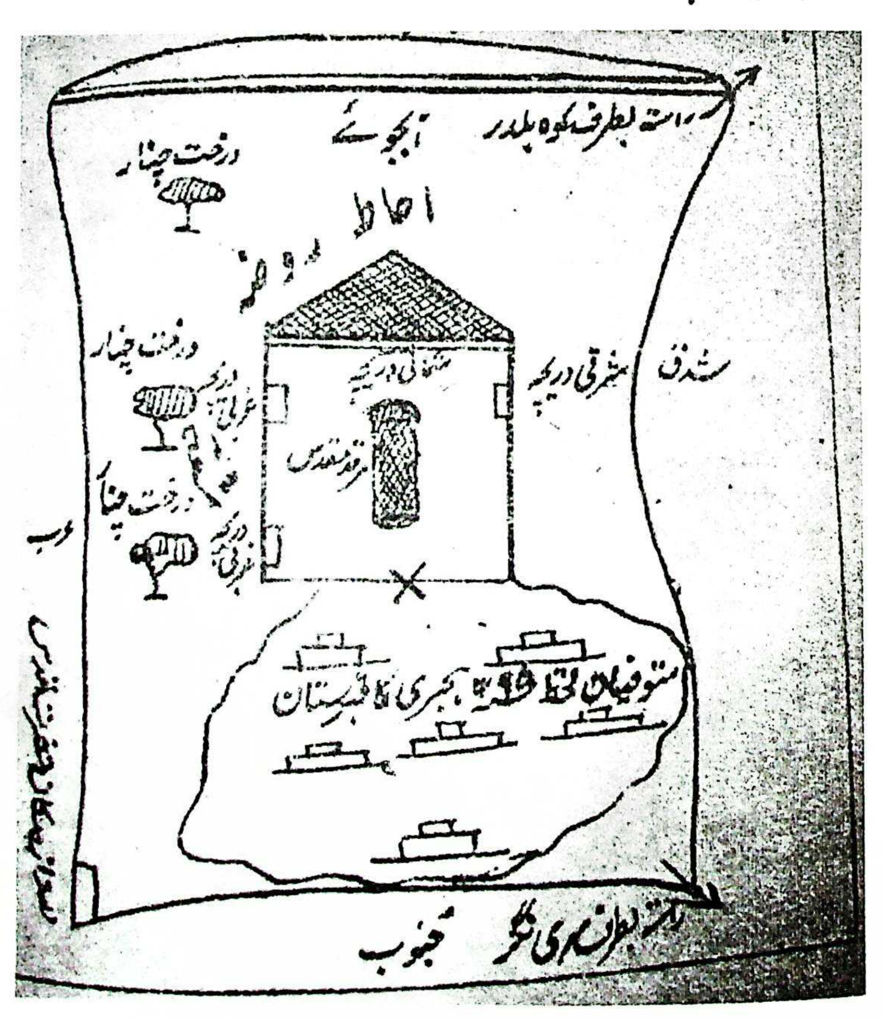
مفصل کیفیت یہ ہے۔

وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال پیشتر (۱۳۴۲ھ کے وسط میں) ایک دن حضور لامع النور نے ایک ارادتمند خاص مسمی رجب ڈار ساکن موضع ملک چاڈورہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اَب میرے یہاں سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ باہر ایک قبر میرے لئے تیار کرو۔" پس بمشورہ حضرت غیاث الدین شاہ صاحب مکان کے باہر ایک جگہ قبر[1] کے لئے مقرر کی گئی۔ جس کو حضرت اقدس نے بھی منظور فرمایا۔ اس جگہ جناب شاہ صاحب اور رجب ڈار نے خاص اپنی لاگت سے سرطابہ کی صورت میں ایک پختہ اور وسیع قبر تیار کرائی۔ ایک سال کے وقفہ کے بعد حضرت اقدس نے ایک دن اس قبر پر چار دیواری بنانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ ماہ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ کی دسویں تاریخ یعنی یوم عاشورہ کو زیر اہتمام خواجہ قدوس ایتو برادر خواجہ عزیز ایتو صاحب ساکن ناگام تحصیل سری پرتاب سنگپورہ تعمیر مقبرہ کا کام شروع ہوا۔ اینٹیں حسب ضرورت غلام رسول ڈار فرزند صدیق ڈار ٹھیکہ دار امیرا کدل نے سرینگر سے بھیج دی۔ باقی اخراجات و ضروریات کو بالاشتراک جناب غیاث الدین شاہ صاحب اور خواجہ عزیز ایتو صاحب اور رجب ڈار نے پورا کیا۔ جب تعمیر مقبرہ کا شہرہ عوام میں پھیل گیا تو اکثر معتقدان و ارادتمندان نے بالاتفاق ایک مجموعی لاگت سے وسیع پیمانہ پر عالیشان خانقاہ بنوانے کی

---

[1] یہ وہی جگہ ہے جہاں قحط سال ۱۲۹۵ھ کے لاوارث مسافرین حضرت اقدس نے اپنے دستِ مبارک سے دفن کئے ہیں۔

تجویز کی۔ ابھی یہ مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ کسی شخص نے یہ معاملہ حضرت اقدس
کے گوشگذار کیا۔ اور انہوں نے ایسی خواہش سے اظہار نفرت فرمایا۔ آخر
۱۰/ محرم سے ۱۳/ ماہ صفر المظفر ۱۳۳۴ھ تک کل ۳۲/ ایام میں خشت وسنگ
اور لکڑی کا ایک پختہ اور مربع مقبرہ ۱۹x۱۹/ فٹ کا بنگلہ نما سادہ طریقے پر تیار
ہوگیا۔ تاریخ تکمیل "روضہ بادشاہ" ۱۳۳۴ھ ہے۔ اور اس کا دستی خاکہ
حسب ذیل ہے:۔



۱۱/ ماہ صفر ۱۳۳۴ھ کو جبکہ مقبرہ کا چھت ''بھوج پتر'' دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ابھی نا تمام تھا۔ اور حضرت سلطان الفقرا نے کئی دنوں سے دروازہ بند فرمایا ہوا تھا۔ دور و نزدیک کے اہل حاجات اور عشاق دیدار بکثرت دروازہ کے باہر جمع ہو گئے۔ چند ایک رباب نواز قوال حاضر ہوئے اور انہوں نے خلوت کدہ کے باہر گانا شروع کیا۔ کارکنان تعمیر بھی اس امید پر وہاں چلے آئے کہ شاید اس بہانہ سے دیدار فیض آثار نصیب ہو۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد آنحضور نے دروازہ کھول دیا۔ اور رباب نوازوں پر سخت عتاب فرمایا۔ یہاں تک کہ وہ سب بے سروسامان وہاں سے بھاگ گئے پھر فرمایا کہ

''دیکھو یہ لوگ مجھے رباب سنانے آتے ہیں۔ حالانکہ میرے بدن کا ہر عضو رباب ہے''۔

پھر قدوس ایتو مہتمم تعمیر کو مخاطب کر کے فرمایا۔ کہ

''کیوں صاحب اگر بھوج پتر دستیاب نہیں ہوسکتا تو گھاس کی ہی چھت ڈال دو۔ کیونکہ وقت تنگ ہے''۔

اُس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا یا حضرت بھوج پتر ہی لگائینگے۔ یہ سنکر آپ پھر خلوت کدہ میں تشریف لے گئے۔ اور دروازہ بند فرمادیا۔ تعمیر ختم ہونے کے دوسرے دن ۱۴/ صفر ۱۳۳۴ھ کو پھر دروازہ کھلا اور معمار ان

ونجاران کو دعا کے ساتھ رخصت عطا فرمائی۔ نجاران میں سے چند ایک ناگام کے رہنے والے تھے۔ جنکو اپنی طرف سے خواجہ عزیز ایتو صاحب نے اجرت دیکر یہاں کام کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ ان میں ایک شخص مسمی سلام نجار لاولد تھا۔ اس نے بروقت روانگی اُجرت منظور نہ کی۔ اور خواجہ صاحب سے کہا کہ مجھے اُجرت کے عوض اولاد چاہئے۔ خواجہ صاحب نے اسکو اپنی آرزو رحیمی دربار میں پیش کرنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ جب عام نجاران و معماران کے ساتھ رخست کے وقت یہ شخص بھی پیش ہوا۔ تو اس نے بہت کچھ کوشش کی کہ وہ اظہار تمنا کرے۔ مگر حضرت اقدس کے رعب جلال نے اسے لب ہلانے کی اجازت نہ دی۔ اور کسی طرح بھی اس کے دل کی تمنا اسکی زبان تک نہ آئی اگر سائل میں اظہارِ سوال کیلیئے قوت نہ تھی تو کیا ہوا حضرت سلطان الفقرا کے ضمیر حقیقت آگاہ کو رموزات مافی الضمیر کے دیکھنے اور سننے کی طاقت تو تھی۔

جام جہان نما است ضمیرِ منیرِ دوست
اظہار احتیاجِ خود آن جا چہ حاجت است

حضرت اقدس نے بشارت کے طور پر ایک سیب اس کو عطا فرمایا نو ماہ کا عرصہ گذرنے پر بماہ ذیقعد ۱۳۳۴ھ اس کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا۔ جو اس وقت تک بفضلہٖ موجود ہے۔

اس کے بعد آنحضور نے اپنے خاندان کے کچھ قدیم و جدید حالات

بیان فرمائے۔ اوضاع و اطوار اور طرز کلام سے کسی قسم کی جسمانی تکلیف یا علالت کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ مگر انہوں نے فرمایا کہ میں بیمار ہوں۔ حاضرین مجلس نے فرداً فرداً شیرہ وشربت بنانے کی اجازت مانگی لیکن انہوں نے انکار فرمایا آخر قدوس ایتو کی درخواست منظور ہوئی۔ چنانچہ اس نے اسی دن سرینگر سے چند چیزیں لاکر پیش کیں۔ اور حضرت اقدس نے کچھ دنوں تک غذا کی جگہ بادام خشخاش تخم خیارین وغیرہ کا شیرہ استعمال فرمایا۔ ۲۰ر صفر کو ایک خادم سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ

"مجھے اب یہاں سے رخصت ہونا ہے۔ اگر تمہارا عقیدہ درست رہا تو میں موجود ہوں۔"

۲۴ر صفر کو جناب پیر غیاث الدّین شاہ صاحب اور خواجہ عزیز ایتو صاحب وہاں شام کے وقت پہنچ گئے۔ اس وقت حضرت سُلطانُ الفقراء اپنی عزلت گاہ کے دروازہ پر جلوہ افروز تھے۔ شاہ صاحب نے پکایا ہوا ایک مرغ پیش کیا۔ انہوں نے کسی قدر گوشت تناول فرما کر باقی حاضرین میں تقسیم کردیا۔ حضرت اقدس کچھ عرصہ سے خواجہ عزیز ایتو پر (بوجہ اس کی بعض غلطیوں کے) کسی قدر رنجیدہ خاطر تھے۔ اس وجہ سے خواجہ صاحب ذرا دور ہی ٹھہرے بلکہ سرینگر سے روانہ ہوتے وقت اس نے شاہ صاحب سے یہ گذارش کی تھی کہ حضرت اقدس مجھے دیکھ کر چین بچین ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ میرا قصور ان سے معاف کرادیتے تو میرے لئے یہ مہربانی دولت دارین سے کم نہ تھی اس خیال سے شاہ صاحب نے حضرت اقدس سے عرض کیا۔ یا حضرت یہ "عزیز" ہے۔

فرمایا ''ہاں صاحب! میں اسکو جانتا ہوں۔ ''یہی وہ شخص ہے جس نے مردوں[1] کو عورتوں کی شکل میں دیکھا اور عورتوں کو مرد تصور کیا''۔ اور دو چار کلمات کے بعد فرمایا کہ ''اچھا اب ویسا نہیں کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ تم آپس میں کیا کرتے تھے۔ آئندہ برادرانہ طور پر رہنا چاہیئے''۔ اس کے بعد خلوت خانہ کا دروازہ بند فرمایا۔ دوسرے دن یک شنبہ کو سارا دن دروازہ بند رہا۔ دوشنبہ (۲۰ پوہ ۱۹۷۲ب) کو عزیز ایتو کی تاریخ پیشی عدالت صدر سرینگر میں مقرر تھی۔ اس لئے شام کے وقت جناب شاہ صاحب کے ہم رکاب دوسرے دن علی الصبح یہاں سے روانہ سرینگر ہونے کا مشورہ کیا۔ رات کے ایک بجے ایک خادم نے خواجہ عزیز ایتو کو جگایا کہ حضرت اقدس نے دروازہ کھولا ہے۔ اٹھو اجازت حاصل کرو۔ چنانچہ وہ اجازت کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت اقدس نے خواجہ عزیز کو بہت تسلی دے کر فراخدلی سے رخصت عطا کی۔ صبح کے چار بجے جبکہ دروازہ ابھی کھلا ہی تھا۔ اور آنحضور تنہا بیٹھے تھے۔ رجب ڈار ملک چاڈورہ حصول رخصت کے لئے حاضر ہوا۔ اسکو مصافحہ کے ساتھ رخصت دی۔ اور

---

[1] کچھ عرصہ پیشتر شاہ صاحب اور خواجہ صاحب کے درمیان کسی بات پر اَن بن ہو گئی تھی۔ اسی اثنا میں خواجہ صاحب ایک دُنیاوی صدمہ میں گرفتار ہو گئے۔ اس وقت اُن کے پاس ایک ''طالب دنیا'' درویش موجود تھا جو لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے اپنے آپ کو حضرت سلطان الفقرا کے دامن ارادت سے وابستہ ہونا ظاہر کرتا تھا۔ خواجہ صاحب نے اُس سے پوچھا کہ یہ صدمہ شاہ صاھب کی رنجیدگی کا نتیجہ تو نہیں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ مجھے بذریعہ الہام بتایا گیا ہے کہ غیاث الدین شاہ میری عورت ہے پس آئیندہ کیلئے خواجہ صاحب اسی خیال سے دیکھتے تھے۔ اور اس فقرہ میں جو اشارہ ہے وہ اسی واقعہ کی طرف دلالت کرتا ہے۔

دروازہ بند فرماتے وقت فرمایا کہ ''اب یہی آخری رخصت ہے''۔ اس وقت تک بھی حضرت اقدس کی صحت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ حسب معمول نشست و برخاست اور خورد و نوش اور کلام کرتے تھے۔

چونکہ خواجہ عزیز ایتو نے رات کے ایک بجے اجازت روانگی حاصل کی تھی۔ پس وہ صبح کی روشنی نمودار ہونے کے انتظار میں اُوپر جا کر جناب شاہ صاحب کے پہلو میں سو گیا۔ عالم رویاء میں حضرت اقدس جلوہ گر ہوئے۔ اور فرمایا ''اٹھو سری نگر جاؤ۔ غیاث الدین صاحب آج یہیں ٹھہرینگے۔ ان کو مہر سلیمانی دی جائیگی''۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا یا حضرت میرے لئے کیا رکھا۔ فرمایا ''ہنٹر اور رسی رکھی گئی ہے''۔ عرض کیا انہیں کیا کرونگا۔ فرمایا ''اچھا دیکھا جائیگا۔ یہیں تک دیکھنے پایا تھا۔ کہ شاہ صاحب نے پہلو سے اس کو جگایا اور کہا اٹھو صبح نزدیک ہے۔ سرینگر جاو، میں آج تمہارے ساتھ نہیں آؤنگا۔ پس خواجہ عزیز ایتو روانہ سرینگر ہوا۔ اور شاہ صاحب اس دن (سوموار) کو یہیں ٹھہر گئے۔

۲۸ر صفر کی شب درمیانی کو بارہ بجے کے قریب دروازہ کھلا اور شاہ صاحب اندر داخل ہوئے۔ اندر سے پھر دروازہ بند ہوا چار گھنٹے تک تخلیہ میں راز و نیاز کی وہ باتیں ہوئیں۔ جن سے کوئی تیسرا آگاہ نہیں ہوا۔ صبح کے چار بجے جناب غیاث الدین صاحب باہر آئے۔ اور حضرت اقدس نے پھر اندر سے دروازہ بند فرما دیا۔ شاہ صاحب نے روانگی کے وقت ایک خادم درگاہ مسمی جمال بٹ کو خاص طور پر تاکیداً کہا کہ اگر آج (۲۸ر صفر یوم چہار شنبہ)

دن کے پانچ بجے تک حضرت اقدس نے خود بخود دروازہ نہ کھول دیا تو بذریعہ نجار دروازہ کھلوا کر آنحضور کی کیفیت کو دیکھنا چاہیئے۔ آخر جب دن کے پانچ بج گئے۔ اور خلوت خانہ خاص کا دروازہ نہ کھلا تو خدام نے شاہ صاحب کے پیغام پر عمل کر کے بذریعہ نجار (ترکھان) دروازہ کھلوایا۔ اور اندر چلے گئے۔ حضرت اقدس اس وقت لیٹے ہوئے تھے۔ پھر خود بخود اُٹھ بیٹھے۔ اور خدام سے ہمکلام ہوئے۔ اور شام تک زبان معرفت کی بیانِ گوہر ریزی سے حاضرین کو مالا مال کر دیا۔ اور کسی قدر قہوہ بھی خوشدلی سے نوش فرمایا۔ اب بھی کسی قسم کے آثار علالت ظاہر نہ تھے۔ البتہ دردسر کی شکایت بیان کی۔ دس بجے شب کے قریب خدام کو رخصت کیا اور پھر دروازہ اندر سے بند فرمایا۔ دوسرے دن (۲۹ رصفر یوم پنجشنبہ) کو جب پھر شام کے پانچ بجے تک دروازہ نہ کھلا تو خدام اور دیگر معتقدین و حاضرین میں تردد پیدا ہوا۔ شام کے وقت بذریعہ ترکھان پھر دروازہ کھلوایا گیا۔ اور خدام اندر داخل ہوئے۔ اس وقت بھی آنحضور پاؤں پھیلا کر لیٹے ہوئے تھے خدام کو ارد گرد دیکھ کر حضرت اقدس اُٹھکر دوزانو بیٹھ گئے۔ پھر اہل مجلس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ

"عشق حقیقی آب وگل کی قید سے مستثنیٰ ہے ناپائدار رنگوں سے اپنے آپ کو رنگین مت کرو۔ وہ رنگ اختیار کرو۔ جس کو دنیا کا کوئی پانی یا دھوپ کمزور یا ضائع نہ کرے۔ دل کو خراب مت کرو۔ اور صاحب دل کے سوا کسی کے آگے سر خم مت کرو۔"

اس قسم کی درفشانی نصف شب تک ہوتی رہی۔ مگر افسوس ہے کہ ان انمول کلمات کو کوئی شخص بہ تفصیل بیان نہیں کرسکتا۔ رات کے بارہ بجے کے قریب حضرت اقدس نے قبلہ کی طرف رخ کر کے خدائے ارحم الراحمین کے آگے سجدہ کیا۔ اور تقریباً صبح کے چار بجے تک سر بسجدہ رہے۔ پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر دنیا کی تمام قوموں اور تمام مخلوقات کے لئے فرداً فرداً دعا مانگی۔ اس کے بعد جادہ پیمائے دشت فنافی اللہ۔ شہسوار وادی بقا باللہ۔ سلطان اولیائے کبار۔ سرآمد عرفائے روزگار۔ کاشف اسرار نہانی۔ واقف معارف ربانی۔ حقیقت دان رموز شریعت۔ صدر نشین بزمِ طریقت۔ غواص بحرِ حقیقت۔ سقائے دریائے معرفت۔ حضرت سلطان الفقراء وصل حقیقی کی نوید سنکر بزم محبوب کی مراجعت پر تیار ہوئے۔ عبدالغفار صاحب (برادرزادہ حضرت اقدس) کا بیان ہے کہ صرف اس قدر معلوم ہوا کہ ان کے روئے انور سے ایک نور کا شعلہ اُٹھ کر آسمان کی طرف چلا گیا۔ غرض بتاریخ یکم ربیع الاول ۱۳۳۴ھ المقدس مطابق ۷ رجنوری ۱۹۱۶ء۔ یکم پھاگن کشمیری یوم جمعہ بوقت ۵ بجے صبح شہباز روحِ مقدس قفس عنصری سے پرواز کر کے آشیانہ گزین گلزار جنان ہوا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

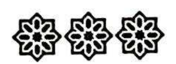
جیسا کہ قبل ازیں لکھا گیا ہے۔ حضرت سُلطانُ الفُقراء ظاہری طور پر بیمار نہیں تھے۔ آخری وقت تک کسی کو ان کی رحلت کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ اسلئے اس موقعہ پر یہاں کوئی بیرونی خلقت فراہم نہیں تھی۔ تاہم یہ خبر بجلی

کیطرح آناً فاناً پھیل گئی۔اور طلوع آفتاب سے پہلے ہی ملحقہ دیہات کے لوگ جوق در جوق یہاں آنے لگے۔اور صحن مکان و احاطہ مقبرہ عام خلقت سے پُر ہو گیا۔اور تل دھرنے کی گنجائش نہ رہی۔غسل خلوت خانہ خاص میں ہی ایک عمر رسیدہ اور نیک مرد کے ہاتھوں سے دلوایا گیا۔اکثر محبان و عاشقان نے غسل کے موقع پر اندر جانے کی اس لئے کوشش کی کہ وہ آب غسل کو تبرکاً حاصل کر سکیں۔مگر دروازہ فوراً بند کر دیا گیا۔نوبت دروازہ توڑنے پر پہنچ گئی۔اور فساد کا احتمال ہو گیا۔مگر بعض فہمیدہ لوگوں کی فہمائش سے معاملہ بخیر گذر گیا۔غسل کا پانی سب زمین نے چوس لیا۔اور بالکل نمی باقی نہ رہی۔کفن کے لئے غفار جُو دوکاندار موضع صفا پور نے ایک عمدہ اور نفیس لٹھ کا تھان پیش کیا۔اور کہا کہ مجھ کو رات کے آخری حصہ میں عالم رویا، میں ہدایت ہوئی ہے کہ بادشاہ بحر و بر حضرت سلطان الفقرا کا انتقال ہو گیا۔ فلاں تھان لٹھ کا لیکر حاضر ہو جاؤ۔اس لئے میں کسی شخص کا کپڑا استعمال ہونے نہیں دونگا۔چونکہ اکثر مُحبوں اور ارادتمندوں نے نہایت شوق سے اچھے اچھے تھان پیش کئے تھے۔اور ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ اس سعادت کی آرزو تھی۔مگر غفار جو نے ایک بھی نہ مانی۔چنانچہ اس پر بہت بڑا جھگڑا ہوا۔ مگر اس نے اپنی خواہش پر کسی کو غالب نہ آنے دیا۔حتی کہ اس نے قیمت لینے سے بھی انکار کیا۔جب جنازہ باہر آیا۔تو لوگوں کے آہ و بکا سے ماتم عظیم برپا ہوا۔خاص و عام کی چیخ پکار سے صفا پور کی زمین کانپ اٹھی۔مخموران بادہ رحیمی کے دلدوز نالے کوہ ہلدر سے ٹکرا کر ایسے معلوم ہوتے تھے۔کہ گویا

زمین و آسمان، مرغ و ماہی، وحوش و طیور ترانہ الفراق میں انکے ہم آہنگ ہیں۔ نماز جنازہ احاطہ مقبرہ میں پیر بہاؤ الدین صاحب نقشبندی نے (جو ایک مسلمہ بزرگ اور متقی ہیں) چار ہزار آدمیوں کی معیت میں ادا کی۔ آخر بروز جمعہ بوقت ۱۲ ربجے یہ آفتاب فقر و ہدایت اور نیّر برج معرفت موضع صفا پور کے خاک کیمیا اثر میں بخواب ناز آرام پزیر ہو کر چشم ظاہر بین سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہو گیا۔ فوق

چشمِ ظاہر بین سمجھتی ہے کہ موت آئی تجھے
در حقیقت تو حیات جاوِداں ہونے کو ہے

عمر شریف بحساب شمسی ۸۷ سال اور بحساب قمری ۸۰ سال شمار ہوئی۔



وفات پر عام ماتم داری اور ماتمی اشعار

وادیٔ کشمیر میں کوئی قصبہ، کوئی گاؤں کوئی محلّہ ایسا نہیں ہے جہاں بلا تمیز مذہب وملت حضرت سُلطانُ الفُقراء کے اسم گرامی اور فیض و کمالات سے لوگ واقف نہ ہوں۔ مفصلات کشمیر کے ہر ایک گوشہ اور اطراف و پرگنات سے اہل حاجات یہاں آتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے نام کی شہرت ہر ایک متنفس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور بمصداق ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد

اکثر لوگ نادیدہ ہی ان کے فیوض باطنی اور کمالات روحانی کے معترف تھے جب آنحضور کے انتقال پر ملال کی خبر صفاپور کی چاردیواری سے باہر نکلی۔ تو ایک ہی دن میں یہ خبر تار برقی کی طرف کشمیر کے ہر گوشہ میں پھیل گئی اور بیشمار خلقت گریاں ونالاں اور سینہ کوباں صفاپور کی طرف روانہ ہوئی۔ ایک ہی دن میں قریہ صفاپور ماتم کدہ عظیم ہوا۔ چالیس یوم تک مزار مقدس پر قرآن خوانی اور عزاداری کی مجلسیں منعقد ہوتی رہیں۔ لوگ برابر

آتے جاتے رہے۔ ہر ایک جانب سے الفراق یا رحیمؒ کی دلخراش اور سینہ شگاف آوازیں کانوں میں آتی تھیں۔ گوشت و طعام بکثرت پکوا کر عام حاضرین اور قرآن خوانوں میں تقسیم کیا جاتا رہا۔ اکثر محبوں نے یہاں کے عنادہ اپنے گھروں پر بھی قرآن کریم کے تحائف ان کے روح پر فتوح کی نذر کئے۔ اہل قریہ یا اہل محلّہ کو کھانا کھلایا۔ عوام تو بذریعہ آہ وزاری وگریہ وشیون اظہار فراق کررہے تھے۔ مگر دلدادگان ناز دلربا۔ اور کشتگانِ خنجر تسلیم ورضا۔ اور جاں نثاران کوچہ رحیمی کا عالم ان سے بالکل نرالا تھا۔ ان میں سے بعض تو اس واقعہ جاں فرسا کے سنتے ہی بت کی طرح رہ گئے۔ ان سے بات بھی نہ بن پڑی۔ اور نہ ہی وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک قدم اٹھا سکے گویا حواس خمسہ انہیں جواب دے گئے بعض اسی وقت اس دنیائے عذار سے ایسے بیزار ہوئے کہ انہوں نے فراق محبوب کے مشکل ترین اور نا قابل برداشت صدمہ کو گوارا نہیں کیا۔ اور تھوڑے ہی دن کے بعد مراجعت نمائے بزم محبوب ہوئے بعض ارادتمندوں کے دل و دماغ پر اس قدر صدمہ ہوا کہ جب تک زندہ رہے دنیا و مافیہا سے بیخبر رہے۔ خدام خاص میں ایک نوجوان سخی بٹ نامی تھا۔ جس نے شروع بچپن سے رحیمی دربار میں پرورش پائی تھی۔ اور رات دن حضور کی خدمت انجام دیتا تھا۔ انتقال حسرت مآل پر اُس نے جامہ صبر وشکیبا کو یکدم چاک کرکے راہ بیابان اختیار کیا۔ عرصہ تک بحالت صحرانوردی مفقود الخبر رہا۔ آخر ایک مدت کے بعد لوگوں نے اسے دیکھا۔ اب وہ پورا مجنوں بنا ہوا تھا۔ چنانچہ یہ شخص آج تک اسی طرح

اطراف کشمیر میں مشغول سیاحت ہے۔ اور کسی مقام پر قرار نہیں کرتا۔ اور نہ کسی سے مانوس ہوتا ہے۔

غرض آپ کے شیداؤں، عاشقوں اور جان نثاروں نے آپ کی جدائی کو نہایت سختی سے محسوس کیا۔ کشمیری زبان کے اکثر شاعروں نے ماتمی اشعار لکھے۔ ایام عزاداری میں روضہ رحیم پر آ کر پُر درد لہجوں میں انہیں سنایا جن سے ایک کہرام مچ جاتا تھا۔ اس قسم کے اشعار اور قصیدے اب بھی کشمیری زبان میں اہل کشمیر عموماً اور علاقہ صفاپور کے لوگ خصوصاً سنایا کرتے ہیں۔ چنانچہ نمونہ کے طور پر اسی قسم کے ایک قصیدہ کا مطلع معہ ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

گئے رحیم صأب از دارِ فانی
پاد شاہِ دیں قطبِ لاثانی

(بزبان کشمیری)

اردو ترجمہ:

شاہ عبدالرحیم صاحب دارِ فانی سے تشریف لے گئے۔ (وہ) دین کے پادشاہ اور قطب لاثانی (تھے)۔

راقم بوجہ پابندی ملازمت سرکاری بر وقت رخصت نہ ملنے کے باعث ایام ماتم داری میں کوئی ماتمی قصیدہ تیار نہ کرسکا۔ بعد کے ایک جلسہ پر جبکہ سرمستانِ بادہ رحیمی ہزاروں کی تعداد میں وہاں جمع تھے۔ راقم نے چند

ابیات کشمیری زبان میں بلحاظ عام حاضرین (جن میں اکثر غیر زبانوں سے نا بلد تھے، تیار کر کے ختم خوانی کے بعد خاص مرقد منور کے اندر جا کر سنائے۔ اگرچہ ان اشعار میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ ارباب سخندان ونکتہ سنج داد دیتے۔ لیکن بمصداق ''عاشق راہوے بس است'' حاضرین نے ایک ایک مصرعہ کو تین تین دفعہ دُہرانے پر مجبور کیا۔ آہ وبکاء سے مرقد مقدس کا احاطہ گونج اٹھا۔ اکثر لوگ روتے روتے بیہوش ہو گئے۔ بعضوں کو جنوں کی حد تک نوبت پہنچی۔ وہاں پڑھنے کے بعد راقم کو ان ابیات کی سینکڑوں نقلیں دینی پڑیں چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ سیدھے سادھے ابیات حلقہ رحیمی سے نکل کر عام لوگوں بچوں اور بوڑھوں کی زبان پر چڑھ کر اطراف کشمیر میں پھیل گئے۔ ۱۳۳۸ھ کے موسم سرما میں جبکہ راقم ''حیات رحیم'' کے بعض مقامی حالات دریافت کرنے کے لئے بسواری کشتی صفاپور جا رہا تھا۔ ''سمبل'' کے قریب ''بارہمولہ'' کی طرف سے ایک کشتی آتی ہوئی ملی۔ رات نصف کے قریب گذر چکی تھی۔ اس کشتی میں ایک خورد سال ملاح لڑکا کشتی چلاتے چلاتے نہایت سریلی آواز میں یہ ابیات مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا۔ رات کے سناٹے میں اور دریا کے درمیان اس خوش گلو نو عمر لڑکے کی آواز نہایت دلفریب اور پرسرور معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ اس بیت پر پہنچا۔

چشمہِ بادامو نظر کر سرِژ ٹُل اَز خابِ ناز
اَکھ دماہ وُچھ عاشقن ہنز بیقرأری یار رحیمؒ

(کشمیری)

ترجمہ: بادامی آنکھوں سے نظر (عنایت) کیجئے! اور سر (مبارک) کو خوابِ ناز سے اٹھائے۔ تھوڑی دیر کے لئے عاشقوں کی بے قراری کا ملاحظہ فرما۔ اے رحیمؒ۔

لبِ ساحل ایک کشتی لنگر انداز تھی۔ وہاں سے آواز آئی۔ خدا کے لئے اس بیت کو دوبارہ ادا کرنا۔ جب اُس لڑکے نے یہ بیت دوبارہ سنایا۔ تو کشتی سے وجدانی کیفیت کے دلآویز نعرے سنائی دیئے۔ کشمیر کے بعض فارسی شاعروں نے وفات پر مرثیے لکھے۔ اگر ان کو ایک جگہ بالتفصیل جمع کیا جائے تو بجائے خود ایک رسالہ بن سکتا ہے۔ یہاں صرف دو قصیدوں کے ابیات مادہ تاریخ درج کئے جاتے ہیں۔

۱۳۳۴ھ

چوں چنیں واقع بالعالم روید اد — عاشقان را آہ دل در غش فتاد

دل — غ — ش

۳۴ — ۱۰۰۰ — ۳۰۰

روز آدینہ شد ز روئے جہاں — پیر روشن ضمیر مالک کل

۶۹ — ۱۹

(روئے جہاں ج) — ۳

۷۲ — ۱۹ / بکرمی

حضرت سلطان الفقراء کی وفات کا اثر دنیا پر

حضرت اقدس کی رحلت سے ڈیڑھ سال پیشتر یعنی ۱۹۱۴ء کے وسط میں یورپ کی عالمگیر لڑائی شروع ہوئی تھی ۱۹۱۲ء میں یہ لڑائی پورے زور شور پر تھی۔ مگر یہ وہ وقت تھا کہ کشمیر پر ابھی اس عالمگیر لڑائی کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ باشندگان کشمیر جب کبھی اس جنگ کے غضب ناک واقعات سنتے تھے تو انہیں پورا یقین نہیں آتا تھا۔ بلکہ ایسی داستانوں کو الف لیلیٰ کے فسانوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اہل کشامرہ اس وقت تک بالکل آرام و آسائش میں تھے۔ اور ان کو کسی تکلیف کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۱۲ء کے شروع میں حضرت سُلطانُ الفُقراء راہگرائے عالم جاودانی ہوئے، اسی دن سے کشمیر میں ابتری کے آثار نمودار ہونے لگے اور رفتہ رفتہ انتہائی درجہ پر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں رنگروٹوں کی بھرتی کا مرحلہ پیش آیا۔ تو اہل کشمیر جنگی اہلیت نہ رکھنے کے باعث سخت تشویش میں پڑ گئے۔ اور انہوں نے اس طرز عمل کو مرگِ ناگہانی سے زیادہ خطرناک تصور کیا۔ اگرچہ دربار کشمیر یا گورنمنٹ سے جبریہ بھرتی کا کوئی حکم صادر نہ ہوا تھا۔

اور نہ وہ ایسی کارروائی کے خواہشمند تھے۔ لیکن چند حریص اور لالچی غیر ذمہ دار اشخاص نے اپنے اغراض نفسانی کے لئے بے زبان کشمیریوں پر وہ سخت گیری کی کہ ''افاغنہ'' تشددات اور سکھا شاہی کے تظلمات کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ کشمیر کے ہر ایک گاؤں سے بحثیت مجموعی ایک ایک رنگروٹ مانگا گیا۔ چونکہ اپنی رضامندی سے کوئی شخص جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے نمبرداران وسرکش زمینداران نے گاؤں کے کسی غریب اور غیر کاشتکار ڈوم یا چمار کو کچھ رقم دیکر گاؤں کی طرف سے جانے پر آمادہ کر دیا۔ ان میں بعض ایسے تھے جن کو رقم کی لالچ اور سقیم الحالی نے ایسا کرنے پر راضی کیا۔ مگر اکثر لوگ وطن کی فاقہ کشی کو ایسی ملازمت سے بدر جہا بہتر جانتے تھے۔ مگر نمبرداران نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ حیلہ وعیاری سے سبز باغ دکھا کر ان کو راضی کیا۔ ان کے پسماندگان، والدین ان کی مفارقت پر ہزار ہزار آنسو بہاتے تھے۔ مگر شنوائی نہیں ہوتی تھی۔ مسٹر اے۔ ایم سٹو صاحب بہادر کمشنر بندوبست کشمیر۔ جب ایک دفعہ علاقہ لار تحصیل خاص کے بھرتی شدہ رنگروٹوں کا ملاحظہ فرمانے کے لئے ''ملہ شاہی باغ'' میں بسواری موٹر تشریف لے گئے۔ تو ان کو حدود شہر سے نکل کر راستہ کے دونوں طرف قدم قدم پر برابر ملہ شاہی باغ تک (جو سرینگر سے ۱۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) ضعیف العمر عورتیں اور ناتواں بوڑھے گریاں و نالاں نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے فرزندوں کو بغیر ان کی رضامندی کے جبریہ طریقہ سے رنگروٹ بنا کر ملک سے باہر لے

جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ صاحب بہادر پر اس حسرتناک واقعہ کا نہایت اثر ہوا۔ وہ مظلوموں کے فریاد سننے کے لئے دو چار میل تک پیدل چلے۔ اور جس قدر رنگروٹ وہاں جمع ہوئے تھے۔ ان کو حکم دیا کہ تم میں سے جو اشخاص اپنی دلی خواہش سے بھرتی ہو کر جانا چاہتے ہیں وہ وہی پر رہیں۔ اور باقی سب لوگ واپس چلے جائیں۔ ان کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا اس حکم کے سنتے ہی ماسوائے دو تین آدمیوں کے سب لوگ چلے گئے۔ آئندہ کے لئے صاحب موصوف نے بذریعہ تاکیدی احکامات ویلی کشمیر میں اس طرز عمل کو بند کرا دیا۔ لیکن اس سے پہلے جو طوفان برپا ہوا تھا۔ اس کا کیا علاج ہوتا اہل کشمیر کو معلوم ہی تھا کہ حکومت کی طرف سے جبریہ بھرتی کا کوئی حکم نہیں ہے۔ مگر اپنے ناعاقبت اندیش بھائیوں کے جبریہ طریقہ سے انکو پائے گریز نہ تھا۔ عام لوگوں نے اسی لئے اس بھرتی کا نام "رضامندی بالجبر" رکھا تھا اس رضامندی بالجبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں غریب نوجوان نمبرداران وغیرہ کے بیجا دباؤ سے ایسے ڈر گئے کہ انہیں ہمیشہ کے لئے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور غیر ممالک میں جا کر اپنے والدین اور اعزہ واقارب کے لئے زندہ در گور ہو گئے۔ ادھر باشندگان دِہ ان سختیوں میں مبتلا تھے۔ اُدھر اہلیانِ شہر کو غلہ کی کمیابی بلکہ نایابی نے پریشان کر دیا۔ غلہ کے ساتھ ہی اور چیزیں بھی ازقسم کپڑا وغیرہ گراں قیمت پر پہنچ گئیں۔ مگر ان کی گرانی یا کمیابی مہلک نہیں تھی۔ آخر شہر باشوں کی آہ وفریاد رحمدل والی ملک کے ایوان عالی تک پہنچی۔ دربار سے انتظام مناسب کا حکم صادر ہوا۔ غلہ داران۔ لکڑی فروشا، قصابان،

نانبایان کو سرکار کے مقرر کردہ نرخ پر فروخت کی ہدایت کی گئی۔ بعض غلہ داران و قصابان کو خلاف ورزی پر سزائیں بھی دی گئیں۔ زمینداران سے بقیمت نقدی سرکاری طور پر شالی خرید کر کے شہر میں فروخت کا انتظام کیا گیا۔ مگر نتیجہ برعکس نکلا۔ اہلکاران نے رضامندی بالجبر کی آڑ میں غریب رعایا کے خون سے ہاتھ خوب رنگے۔ جو زمیندار ذرا متمول تھے۔ انہوں نے ''قاضی الحاجات'' کو وسیلہ بنا کر اپنی عزت بچائی اور غلے کو محفوظ رکھا۔ مگر تہیدست اور کم طاقت زمینداران کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ وہ ناگفتہ بہ ہے۔ بے رحم عمال نے دوسروں کی کمی پوری کرنے کی خاطر ان کے غلہ دان بالکل صاف کردیئے۔ اور ان کے پاس چند یوم سے زیادہ خوراک نہ رہنے دی۔ اگر کسی ایسے مظلوم نے اعلیٰ حکام کے پاس واویلا کیا۔ تو اہلِ کاران نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے زمین کے نیچے غلہ دبا رکھا ہے۔ اس طرح مظلوم کی فریاد بے اثر ثابت کر دیتے تھے۔ سرینگر کی ملحقہ تحصیلات میں دارالخلافے کے نزدیک ہونے کی وجہ سے تباہی نہیں پھیلی۔ اور یہاں اہلِ کاران اپنی خواہشوں اور اپنے ارادوں کو دل کھول کر پورا نہ کرسکے۔ مگر دور دور تحصیلوں میں وہ اندھا دُھند مچایا گیا۔ جس کی تفصیل سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ زمینداروں کے گھر غلہ شالی سے ایسے صاف کیئے گئے۔ کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۹۵ / فیصدی زمیندار فاقہ کشی پر مجبور ہوگئے۔ مکی، جَو، متفرق اجناس، ساگ، سبزی، گھاس بھوس سے فارغ ہوکر زمینداروں کو قحط عظیم کا سامنا کرنا پڑا۔ خیر اس قدر سختی کا سلوک زمینداران

کے ساتھ محض اہل شہر کو کافی غلہ شالی بہم پہنچانے کے لئے کیا گیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ بے زبان زمینداروں کی قربانی غرہائے شہر کو کمیابئ غلہ کی ناگہانی آفت سے نہ بچا سکی۔ شالی شہر میں پہنچائی گئی لیکن عوام اس سے محروم ہی رہی۔ یہ غلہ کچھ تو بذریعہ انڈنٹ ہا محکمہ جات میں تقسیم ہوا۔ باقی جو بچا وہ اور توسل داران نے ہضم کر لیا۔ غریب اور بے زبان مساکین، بیوگان و یتامیٰ کا خدا ہی حافظ تھا۔ ہم نے کئی مرتبہ دیکھا کہ غریب آدمی ایک روپیہ یا آٹھ آنے لیکر شالی کے واسطے جب کسی سرکاری کشتی پر جاتا تھا۔ اور اس کے عیال کو امید رہتی تھی کہ شام کو ضرور کھانا نصیب ہوگا۔ مگر شالی لانے والا شام کو خالی ہاتھ واپس آتا تھا تو گھر بھر میں سناٹا چھا جاتا تھا۔ اسی طرح دو تین آدمی ہر روز شالی کے لئے کشتی پر جایا کرتے تھے۔ مگر ان کو شالی نہیں ملتی تھی۔ اِدھر ان کا عیال اور خورد سال بچے بہت دنوں تک فاقہ رہے۔ بال بچوں کی آہ وزاری اور فاقہ کشی سے تنگ ہوکر ایک دن طبقہ غربا نے شالی کے لئے سخت اضطراب ظاہر کیا۔ کشتی والے نے جب یہ ہجوم دیکھا کشتی کنارہ سے ہٹا کر دریا میں لے گیا۔ غریب لوگ بھی جان پر کھیل کر کشتی کے پیچھے ہی دریا میں کود پڑے۔ یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے کئی لوگ دریا بُرد ہوکر لقمہ نہنگ اجل ہو گئے۔

راقم کا چشم دید واقع ہے کہ ایک دفعہ ایک سرکاری کشتی پر ایک غریب آدمی ایک روپیہ کی شالی لینے کے لئے آیا۔ ایک بے رحم چپراسی نے اس کو لاٹھی سے مارا۔ مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ ہوش سنبھال کر پھر شالی والی

کشتی کی طرف دوڑا۔ سیاہ دل چپراسی نے پھر وہی سلوک کیا۔ وہ بچارا مار کھا کر کچھ دیر وقفہ کے بعد پھر شالی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ مگر افسوس ہے سنگدل چپراسی اپنی وحشیانہ حرکت سے باز نہ آیا۔ آخر میں نے اس ستم زدہ کو ایک طرف کر کے سمجھایا کہ یہاں تم کو شالی نہیں ملیگی۔ کیوں ناحق اپنی بے عزتی کرا رہے ہو۔ اس نے بچشم اشکبار جواب دیا کہ چار دن سے ایک روپیہ کی شالی کے لئے یہاں آ رہا ہوں مگر شالی نہیں ملتی۔ ادھر میرے چھوٹے چھوٹے بچے چار دن سے متواتر بھوکے ہیں۔ ان کی آہ و بکا نے مجھے زیست سے بیزار کر دیا ہے۔ یہ حال تو ان لوگوں کا تھا جو اندر باہر نکل سکتے تھے۔ ناتوان لوگوں معذوروں، ضعیف العمر، بوڑھوں اور پردہ دار عورتوں کا حال تو کسی صورت میں قابل تحریر ہی نہیں۔ چونکہ بازاروں میں عام طور پر غلہ فروخت نہیں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے لوگ زیادہ پریشان حال رہے۔ غلہ داران کے پاس غلہ موجود تھا۔ مگر وہ سرکار کی مقرر کردہ نرخ شالی تین روپے آٹھ آنے فی خروار (دو من) سے زائد نرخ پر فروخت کرنے کے مجاز نہ تھے۔ پس بعض لوگ بڑی منت وسماجت اور بہت دنوں کی عجز وزاری سے کسی خاص آدمی کی وساطت سے ایسے غلہ داران سے بحساب دس روپے (ع) فی خروار شالی لیتے تھے۔ ایسے شخص سے اخفائے راز کی ضمانت لی جاتی تھی۔ غلہ دار بھی سرکاری نرخ پر شالی فروخت کر کے اپنا نقصان برداشت کرانا پسند نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غرباء شہر نے اثاث البیت۔ اپنی جائدادیں، گھر بار فروخت کر کے اسی نرخ پر شالی خرید کر کے اپنی جانیں

بچالیں۔ جولوگ بالکل مفلس تھے۔ یا ۱۰/روپے شالی نہ خرید سکتے تھے۔ ان کو کنج لحد کے سوا کسی نے پناہ نہ دی۔

۱۹۱۸ء کے بہار میں جب رحمدل فرمانروائے کشمیر جموں سے رونق افزائے خطہ ہوئے۔ تو ان کی طبیعت اہالیانِ شہر کی سختی اور تباہی سے نہایت متردد ہوئی۔ بلکہ فاقہ مستان وسوختہ جانان کشمیر کی فریاد شبستان شاہی تک بھی جا پہنچی۔ نیک دل حضور مہارانی صاحبہ نے از روئے تلطفِ خسروانہ غربائے شہر کی امداد کے لئے پچاس ہزار (۵۰۰۰۰) روپے اپنی جیبِ خاص سے بطور خیرات عطا فرمائے۔ اس شاہانہ عنایت کے ساتھ ہی رحمت الٰہی کا دریا بھی کسی قدر جنبش میں آیا اور غلہ (گندم) بھی غیر معمولی طور پر زیادہ پیدا ہوا۔ جس سے شہر ومفصلات کے لوگ کسی حد تک قحط کی بلائے بے درمان سے محفوظ ہوگئے۔ اگرچہ کشمیریوں کی قدیمی اور قومی خوراک چاول ہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے۔ کہ یہاں کے رہنے والوں نے کبھی اور کوئی چیز قبول نہیں کی۔ مگر ۱۹۱۸ء کا موسم گرما ایسا تھا۔ جبکہ اہل کشامرہ نے بلاتمیز شہری ودہ باشی خالص گندم پر گذارہ کیا۔ بہرحال اگر عطیہ سرکار اور لطف پروردگار بروقت مددگار نہ ہوتے تو شہر سرینگر کا خالی ہونا بالکل قرین قیاس تھا۔

جب ۱۹۱۸ء کی فصل پختہ ہوئی تو حکام نے سال گذشتہ کے انتظام کو ناقص اور غیر تسلی بخش قرار دے کر اب باقاعدہ انتظام کرنا شروع کیا۔ چنانچہ زمینداران سے مالیہ جنسی بحساب رقبہ فی ایکڑ دوخروار (چارمن) غلہ شالی لینا منظور ہوا۔ اور اس انتظام وکارروائی کے لئے ایک علیحدہ محکمہ "شالی

ڈیپارٹمنٹ'' کے نام سے قائم کیا گیا۔ جس میں کافی عملہ بھرتی ہوا۔ زمینداروں سے باضابطہ شالی وصول ہوئی۔ کیونکہ باقاعدہ باچھ پٹواریوں کے ذریعہ مرتب ہوئے تھے۔ گو بعض جگہ وصولی وغیرہ کے بہانہ سے زمیندار سختیوں کے شکار بنے۔ مگر تاہم معاملہ بخیر گذرا۔ ضرورت کے برابر شالی شہر میں پہنچائی گئی۔ اہالیان شہر نے بھی اس خاطر خواہ انتظام کی امید پر اپنے اپنے ذریعہ (جیسا کہ وہ سالہائے ماسبق میں کیا کرتے تھے) حصول غلہ شالی کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور اگر کسی شخص نے ہاتھ پاؤں مارے بھی۔ تو ناکام رہا۔ کیونکہ جب زمینداران سے مالیہ جنسی وصول ہوا تو ان کے پاس فروخت کے لئے جنس ہی کہاں تھی آخر شہر سرینگر کی باقاعدہ مردم شماری ہوئی۔ اور تین پاؤں شالی ۱/۲ ا ر پاؤ چاول، یومیہ کی خوراک فی کس مقرر ہوئی۔ اسی شرح سے سرینگر کے اٹھائیس ہزار (۲۸۰۰۰) گھروں پر فارم ہائے چھاپ شدہ تقسیم کئے گئے۔ جن پر تعداد نفری، مقدار شالی اور قیمت کے علاوہ آئندہ اسوج مہینے تک نمبروار درج تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر ایک فارم والے کو ہر ایک ماہ مندرجہ فارم کے شروع یا آخر پر شالی مذکورہ مندرجہ قیمت پر ملا کریگی۔ چنانچہ اس سسٹم کے مطابق دو تین ماہ تک باشندگان شہر کو باقاعدہ شالی ملتی رہی۔ گو یہ شالی ضرورت سے کم تھی تاہم نہ ملنے سے ہزار درجہ بہتر تھی۔ اس لئے یہ عرصہ کسی قدر اطمینان سے گذرا۔ دو تین ماہ کے بعد یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ اور معلوم نہ ہوا کہ آیا جو شالی جمع کی گئی تھی۔ وہ کہاں گئی۔ اور کیوں انتظام بگڑ گیا۔ پس اہالیان شہر کی فلاکت کا کیا

کہنا تھا۔ وہی سال گذشتہ کی تباہی پھر لوٹ کر آئی۔ مگر اس سال اتنا خدا کا فضل رہا کہ نرخ ریاست کی طرف سے آزاد رہا۔ غلہ اگرچہ کمیاب اور گراں قیمت پر تھا۔ مگر نایاب نہیں تھا۔ جن جن غلہ داران کے پاس سال گذشتہ یا سال روا کا غلہ موجود تھا۔ انہوں نے گراں سے گراں قیمت پر فروخت کر کے گذشتہ سال کی کمی کی کسر کو پورا کر دیا۔ جس سے اگرچہ اہل شہر کا رہا سہا خون بھی ختم ہو گیا۔ مگر صریح ہلاکت کی نوبت نہ پہنچی۔

باشندگانِ کشمیر جن دنوں قحط میں مبتلا تھے۔ خاص انہی ایام میں ہیضہ (کالرا) کی بیماری بھی نمودار ہوئی۔ اس نے قحط سے بڑھ کر اپنا کام کیا لوگ پہلے ہی نیم مُردہ تھے۔ ہیضہ نے سینکڑوں خاندان بے چراغ کر دیئے اور نیم مردہ قوم کو بالکل بے جان کر دیا ۔

میں خود مرنے پہ راضی تھا قضا کے ہاتھ کیا آیا

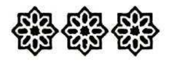
جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس انتظام سے ملک اور شہر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تو ۱۹۱۹ء کے لئے ریاست نے غلہ کو پھر آزاد کر دیا۔ مگر اجناس کی قیمت کا رُخ گرانی کی طرف ہی رہا۔ اور شب و روز بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۱ء کے بہار میں اس گراں فروشی نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ بد اعمالی سے اس سال کشمیر میں بارش نہیں ہوئی۔ اور پیداوار غلات کا زیادہ دارومدار کشمیر میں پانی پر ہی ہے۔ جب غلہ داران نے دیکھا کہ اس سال خاطر خواہ یا حسب معمول غلہ پیدا نہیں ہوگا تو انہوں نے یکدم قیمت

اجناس میں چہار چند اضافہ کر دیا۔ اور ایک روپے کے ڈہائی سیر چاول فروخت ہونے لگے۔ اور کچھ دن کے بعد یہ بھی نابود ہوگئے۔ اس نایابی نے شہر کے ہر فرد بشر کو سراسیمہ کر دیا۔ اور ہر کوئے و برزن سے "آہ بتہ"!! آہ بتہ"!! کی فریادیں بلند ہوئیں۔ معصوم اور بے زبان بچوں کی آہ وزاری سے آسمان ہل گیا۔ آخر جب لوگوں کو ہر طرف سے مایوسی ہوئی۔ تو پھر سرکار کے دروازے پر گئے۔ اور بچشم خون بار اپنی حسرت بھری داستان اور جگر خراش دُکھڑا سُنایا۔ اس المناک واقع سے ولی عہد سلطنت کشمیر (پرنس) سر راجہ ہری سنگھ صاحب بہادر کی امن پسند اور رعایا پرور طبیعت نہایت متاثر ہوئی۔ صاحب ممدوح نے انسداد قحط کے لئے کمیٹی قائم فرمائی۔ آخر پنڈت نریندر ناتھ صاحب کول مشیر مال ریاست کے سپرد انتظام ہوا۔ اس نے پہلے بہت کوشش کی تھی۔ کہ کسی سہل طریقہ سے انسداد قحط ہو جائے۔ جو ناممکن تھا۔ پس زمینداران سے نقد قیمت پر شالی وصول کر کے سرینگر میں پہنچائی گئی۔ اس دفعہ زمینداران کو کوئی سختی نہیں پہنچی کیونکہ انتظام ایسا تسلی بخش ہوا۔ کہ زمینداران وشہری مطمئن رہے۔ شہر میں باضابطہ شالی تقسیم ہو رہی ہے۔ کسی کو شکوہ نہیں۔ خدائے ارحم الراحمین سے بکمال خضوع وخشوع التجا ہے کہ وہ اب ہمارے گناہوں کا دفتر عفو کے پانی سے دھوئے۔ اور آئندہ اس قسم کی سختیاں اور صدمات ہم پر نازل نہ کرے۔ آمین۔!

یہ حیرت انگیز واقعات اور حسرت خیز حالات خطہ کشمیر کے ذرا تفصیل سے درج کئے گئے۔ جو اس قلیل عرصہ میں اس مختصر وادی کے رہنے والوں کو

پیش آئے۔ دنیا کا کوئی حصہ۔ کوئی اقلیم، کوئی براعظم، کوئی ملک، کوئی شہر کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں کے باشندے پریشان اور مبتلائے صدمات و آلام نہیں۔ کہیں کشت و خون کا بازار گرم ہے اور تہذیب کے اس انتہائی دور میں ایسی خونریزی ہوتی ہے کہ جس کی نظیر تواریخ میں نہیں ملتی۔ کہیں قحط کا ایسا طوفان برپا ہے۔ کہ انسان انسان کا گوشت کھانے کو تیار ہے۔ کہیں وباء کی آگ ایسی مشتعل ہوئی ہے کہ لاکھوں جانیں پیوند خاک ہوتی ہیں۔ کہیں فتنہ و فساد کے شرارے بلند ہوئے ہیں۔ جن سے ایک دنیا کو آگ لگ گئی ہے۔ کہیں مذہب کے نیست و نابود کرنے کے سامان ہوتے ہیں۔ با ایں ہمہ دنیا کا کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ فلاسفر اس عالمگیر کشمکش کے انجام پر قطعی رائے زنی نہیں کرسکتا۔ غرض رحم والطاف ایزدی کے آفتاب عالم تاب کے وقت غروب سے

ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شرمے بینم



شمائل حضرت سُلطانُ الفقراء

حضرت اقدس کسی قدر بلند قامت تھے۔ اندام متوسط، ہاتھ اور بازو دراز، سینہ کشادہ، سر مبارک بھارا تھا۔ چوٹی کے بال بوجہ ریاضیات و مجاہدات شاقہ کے نکل گئے تھے۔ صرف گیسوؤں کے بال موجود تھے۔ جو کاندھوں پر پڑے رہتے تھے۔ پیشانی اور جبین کشادہ، بوقت خشم پُرشکن ابرو گھنے اور محراب دار، ایک دوسرے سے منقطع، آنکھیں بادامی سیاہ مست و آبدار موٹی اور اُبھری ہوئی۔ بوقت خشم نہایت سرخ، بینی بلندِ دہن کسی قدر تنگ، ہونٹ نرم و نازک، داڑھی چار انچ کے برابر، سفید مانند برف، چہرہ بیضوی، رنگ گندمی، چہرہ مبارک پر داغ چیچک نہایت خوشنما، نہ زیادہ نمایاں اور نہ زیادہ غائب، آواز نہایت بارعب، کلام میں حد سے زیادہ فصاحت و بلاغت، قوت بیانیہ ان کے دماغ میں ودیعت ہوئی تھی۔ بوقت گفتگو بہت سے آدمیوں کا کلام معلوم ہوتا تھا اور رفتار نہایت تیز اور قدم دور دور اُٹھاتے تھے۔ آپ بعمر ۷۸ سال رحلت فرمائے عالم جاودانی ہوئے۔ آخری دم تک بالکل تندرست رہے کسی قسم کی کمزوری پیدا نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ دندان مبارک بالکل صحیح و سلامت تھے۔ اور گیسوؤں کے اکثر بال ابھی سیاہ تھے اور وہ ایک قوی ہیکل جوان کی طرح چل پھر سکتے تھے۔

حضرت سُلطانُ الفُقراء کے اخلاق وعادات

حضرت سلطان الفقراء ولی مادر زاد تھے۔ اور انہیں اویسی طریقہ سے فیض باطنی حاصل ہوا تھا۔ اوائل عمر سے وہ لباس مطابق شریعت رکھتے تھے۔ اور عمامہ بھی باندھتے تھے۔ جب ان کی عمر چالیس سال تک پہنچ گئی اور وہ روحانی نور جو قدرت نے ان کی ذات مقدس میں رکھا تھا، ظہور پذیر ہوا، تو وجدان و سرور بلکہ حالت سُکر نے غلبہ کیا۔ تمام چیزوں سے دست کش ہو گئے۔ اس کیفیت کی ابتدا ہندی قلندر صاحب کی ملاقات یا اپنی پھوپھی صاحبہ کی وفات سے ہوئی۔ انہوں نے دستار باندھنا بھی چھوڑ دیا۔ اور برہنہ پاؤں چلنے لگے۔ اب صرف ان کے جسم مبارک پر ایک ہی کُرتا ہوتا تھا۔ لوگوں کی صحبت سے سخت ہراساں و گریزاں رہتے تھے خورد و نوش اور لذّت دنیاوی سے بیزار ہو گئے۔ کچھ عرصہ صرف چاول کا دھویا ہوا گرم پانی استعمال فرماتے رہے۔ اس کے بعد کچھ مدت تک کسی قدر جَو کا سَتّو گرم پانی کے ساتھ گھول کر نوش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ان کو پسند نہیں تھی۔ اس استغراق کے عالم میں بھی وہ کبھی عریاں نہیں رہے اور لوگوں کے ساتھ بات

چیت بھی نہیں کرتے تھے اسی حالت کے دوران میں اپنے گھر پر عزلت نشین ہوئے۔ تھوڑا ہی عرصہ گذرنے کے بعد حضرت غیاث الدّین شاہ صاحب ان کی خدمت فیض درجت میں حاضر ہوئے۔ تو ان کے طرزِ زندگی میں کسی قدر تبدیلی ہوئی۔ چونکہ شاہ صاحب ابھی نوعمر تھے۔ اور حضرت اقدس کو خاص طور پر ان کی خاطر منظور تھی۔ اور دل سے چاہتے تھے۔ حضرت اقدس کے ترک لذائذ سے شاہ صاحب کے دل میں طرح طرح کے توہمات پیدا ہوئے۔ آخر اُس نے اپنے ہاتھ سے قہوہ تیار کر کے حضور اقدس کو پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ

''میں نے یہ چیزیں چھوڑ دی ہیں''۔

شاہ صاحب نے بکمال عجز و انکسار عرض کیا: ''حضور محض میری خاطر تھوڑا سا نوش فرمائیں۔'' پس آنحضور نے منظور فرمایا۔ اسی طرح شاہ صاحب نے وقتاً فوقتاً دو تین اور کھانے والی چیزیں نہایت خلوص سے پیش کیں۔ حضرت اقدس ان کے پاس خاطر سے کوئی چیز نامنظور نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ آنحضور لطیف اور سریع الہضم چیزوں کے کسی حد تک عادی ہو گئے۔ شاہ صاحب ہمیشہ چار پانچ یوم کے بعد میوہ یا گوشت وغیرہ ساتھ لیجا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اور ان کو کھلاتے تھے۔ اور ان کی رخصت پر آنحضور صوم رکھتے تھے۔ اور ان کے دوبارہ آنے پر ان کی ہی لائی ہوئی چیزوں سے افطار فرماتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ غیاث الدین شاہ صاحب بہ اِرادہ سیاحت

جنگل کی طرف چلے گئے۔ اور بہت دن مصروف سیر رہے۔ جس سے معیاد مقررہ پر اپنے مرشد و مولا کا نیاز حاصل نہ کر سکے۔ آخر دروازہ فیض پناہ پر پہنچ کر انہوں نے قہوہ تیار کر لیا۔ اور نہایت خوف و دہشت سے لرزاں و ترساں حاضر ہوئے۔ آنحضور نے غلبہ اشتیاق سے پہلے ان کو گلے لگایا۔ پھر زبان فیض ترجمان سے فرمایا "شاہ صاحب !! میں نے دنیا کی اشیاءِ خورد و نوش چھوڑ دی تھیں۔ مگر آپ نے پھر مجھے عادت ڈال دی۔ اب بھی آپ کی عدم موجودگی میں صوم کامل رکھتا ہوں۔ اس دفعہ آپ نے اس قدر ایام صرف کئے۔ کیا آپ کو اپنے والد کے افطار کرانے کا خیال ہی نہ رہا"۔ شاہ صاحب تو پہلے ہی ہراساں تھے۔ ہاتھ جوڑ کر عرض کیا:

> "یا حضرت !! میں جنگل کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ نہایت بے احتیاطی اور بیدردی سے جنگل کے درختوں کو کاٹ رہے ہیں۔ اگر چند مہینے یہی حال رہا تو کشمیر کے اردگرد لکڑی کا کوئی جنگل نہیں رہیگا۔ بعد میں تعمیرات وغیرہ کے واسطے دقعت ہوگی۔"

اگر چہ یہ ماجرا اپنے اندر ضرور صداقت رکھتا تھا۔ لیکن جواب برمحل نہیں تھا۔ شاہ صاحب نے محض حضرت اقدس کا رخ تبدیل کرنے کی خاطر یہ مسئلہ چھیڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ سے ان کی طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ اور فرمایا کہ اچھا بہت جلد اس کا انتظام ہو جائیگا پس تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کشمیر میں محکمہ جنگلات (فارسٹ ڈیپارٹمنٹ) قایم ہو گیا۔

جب اس بات کا عام چرچا ہوا کہ حضرت سلطان الفقرا پھر کھانے پینے کی طرف قدرے راغب ہوئے ہیں۔ تو اور محبوں اور معتقدوں نے بھی لطیف لطیف کھانے والی چیزیں پیش کرنی شروع کیں، چونکہ آپ کو کسی کی دل شکنی منظور نہیں تھی۔ ان کا وجود باجود سراسر رحم و انصاف سے بھرپور تھا۔ اس لئے کبھی کبھی کسی خاص ارادتمند اور فدائی کے ہاتھ سے کوئی چیز کھالیا کرتے تھے۔ زیادہ تر لسی، دودھ، دہی، گلہتی، (کشمیری وُگرہ) ان کو پسند تھا۔ میوہ جات شہتوت، گلاس، خوبانی، سیب، خربوزہ اور تربوزہ شوق سے کھاتے تھے۔ گوشت سے ان کو نہایت کم الفت تھی۔ البتہ شاہ صاحب کے ہاتھ سے گوشت کا کوفتہ کسی قدر کھالیا کرتے تھے۔ اگرچہ اب حضرت اقدس خورد و نوش کی طرف راغب تھے۔ مگر وہ عام اصول کے مطابق باقاعدہ نہیں کھاتے تھے۔ دو چار دن کے بعد جب کھاتے بھی تھے تو نہایت کم جب کوئی کھانے والی چیز پیش ہوتی تھی۔ تو اس میں سے صرف دو تین لقمے تناول فرما کر باقی حاضرین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ کسی وقت ان کو سیر ہو کر کھاتے نہیں دیکھا۔ ایک انسان کی خوراک کا دسواں حصہ کھالیا کرتے تھے۔ اسی طرح خربوزہ یا تربوزہ کا ۲۰/۱ حصہ بہ مشکل کھاتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو قہوہ کی ایک سالم پیالی پیتے نہیں دیکھا۔

وقوعہ آتش کے بعد جب مکان سہ طبقہ از سر نو تیار ہوا تو سب نے بالاتفاق حضرت اقدس کی رہائش کے لئے سب سے اوپر کی منزل میں ایک کوٹھری مقرر کی۔ مگر انہوں نے سب سے نیچے کے طبقہ میں پسند فرمائی۔ اور

اسی میں عمر شریف کے بقیہ ایام بسر فرمائے۔ یہ کوٹھری ۲۴ رفٹ مربع تھی۔ اور اس کا ایک ہی دروازہ جانب غرب ایک دوسرے کمرے کی طرف تھا۔ اور ایک چھوٹی کھڑکی ایک ایک فٹ مربع جانب مشرق تھی۔ جس میں سے نہایت کم روشنی اندر آتی تھی۔ تقریباً تیس سال کا عرصہ آنحضور نے اسی تنگ وتاریک کوٹھری میں گذار دیا۔ ہر حالت اور ہر موسم میں یہی قیام گاہ تھی ایام گرما میں جبکہ سخت گرمی پڑتی تھی۔ اور لوگ کھلے میدانوں اور باغیچوں میں سبزہ زار و آبشار پر بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ دن کو گرمی اور رات کو مچھروں کی تکلیف ہوتی تھی۔ حضرت اقدس اس کوٹھری سے باہر کہیں قیام نہ فرماتے تھے۔ البتہ دن کو پہاڑ پر ضرور تشریف لے جایا کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی کوئی فرحت افزا مقام نہ تھا۔ نہ وہاں پانی میسر اور نہ کسی درخت کا سایہ گرمی معمول سے زیادہ اس پر چڑھنے اور اُترنے کی تکلیف سب سے علاوہ تھی۔

ابتدائے خلوت نشینی ہی سے آپ کا خاص طریقہ تھا۔ کہ وہ دو چار دن کے بعد ہمیشہ چار پانچ یوم کے لئے (بعض اوقات ایک ایک ہفتہ تک) خلوت کدہ کا دروازہ اندر سے بند فرما دیا کرتے تھے۔ ان ایام میں صوم کامل رکھتے تھے۔ کسی شخص کی عجز وزاری یا اصرار ان کو قبل از وقت دروازہ کھولنے پر مجبور نہیں کرسکتا تھا۔ جس قدر لوگ باہر سے زیارت کے لئے آتے تھے۔ ان کو بہر حال انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کوئی شخص بیان نہیں کرسکتا۔ کہ آیا اس عرصہ میں ان کا کیا شغل رہتا تھا۔ اور ضروریات بشریت کو وہ کس طرح پورا کرتے تھے۔ بعض اوقات دروازہ بند ہونے کی حالت میں رات کے وقت حضرت اقدس

کلام بھی کرتے تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ آیا مخاطب کون ہے اور کس سے ہم کلام ہیں۔ بعض اہل حاجات کا قول ہے کہ ہم نے حضرت اقدس کی اسی قسم کی گفتگو سے اپنی دلی خواہشوں اور مرادوں کا خاطر خواہ جواب پایا ہے۔ اکثر اوقات ایسا بھی دیکھا گیا کہ آج حضرت اقدس نے آٹھ دن کے بعد دروازہ کھولا اور کل پھر دس یوم کے لئے بند فرما دیا ہے۔ دس دن سے زیادہ کبھی دروازہ بند نہیں رہا۔ ابتداء میں اہل حاجات اور خدام دروازہ کھلنے کے لئے بہت کچھ کوششیں کرتے تھے۔ مگر جب کوئی پیش رفت نہ ہوتی تو خاموش ہوتے تھے۔ بعض خدام جان نثار ایسی صورت میں مشرقی دریچہ کی طرف سے جا کر حضرت اقدس کو کسی کھانے پینے والی چیز کے لئے عرض کرتے تھے۔ لیکن بہ استثنائے چند عام طور پر مایوس ہی ہو کر واپس آتے تھے۔

حضرت اقدس نے تمام عمر شریف میں کبھی کوئی چیز کسی سے مانگ کر نہیں کھائی۔ صرف خدام سے گرم پانی مانگ کر نوش فرماتے تھے۔ محبان و معتقدان روزانہ صدہا لذیذ و نفیس نعمتیں پیش کرتے تھے۔ مگر وہ ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ شاذ و نادر کسی میوہ یا نرم اور سادہ غذا سے ایک دو دانے اُٹھا کر باقی حاضرین میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ شروع بچپن ہی سے آپ کو حقہ نوشی کی عادت تھی۔ اس میں آخری بیس سالوں میں بہت کمی ہو گئی۔ درمیان عمر سے نسوار بھی کسی قدر استعمال فرمانے لگے۔ چرس یا بھنگ عمر بھر انہوں نے نہیں پی۔ بلکہ ایسی چیز کو ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے اور اس سے منع فرماتے تھے۔ اگرچہ حضرت اقدس بذاتِ خود خورد و نوش کے پابند نہ تھے۔ مگر

عام لوگوں اور مہمانوں کے لئے رات دن لنگر خانہ جاری رہتا تھا۔

جناب غیاث الدین شاہ صاحب کی مصاحبت سے پیشتر حضرت اقدس غذا کی طرح لباس سے بھی دست کش ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے عرض ومعروضات سے اس میں بھی بہت کچھ اضافہ ہوا۔ یوں تو عرصہ عزلت نشینی میں آپ نے عام طور پر سوت کا کرتہ ہی زیب تن فرمایا۔ لیکن چند بار کوٹ۔ واسکٹ قمیض چوغہ بھی پہن لیا تھا۔ سیر کوہسار پر بعض دفعہ موزہ اور پٹی کا بھی استعمال کیا اسی طرح ایک دفعہ مسی چرم (چمڑے کا موزہ) بھی انہیں استعمال کرتے دیکھا ہے۔ کُلاہ ہمیشہ پٹو کی زیب سر ہوتی تھی۔ ایک دو دفعہ مخمل کی کلاہ بھی استعمال فرمائی تھی۔ بعد میں ناپسند ہوئی۔ پائجامہ ہر صورت اور ہر حالت میں استعمال ہوتا تھا۔ اسی طرح استعمال پاپوش کے بھی آخری ایام میں پابندر ہے۔ صرف مستی واستغراق کی ابتداء میں کچھ عرصہ تک ننگے پاؤں سفر کرتے تھے۔ کپڑا ہاتھ کا بنا ہوا ان کو زیادہ پسند تھا۔ پوشاک کی چیزیں زیادہ تر شاہ صاحب یا عزیز اینتو صاحب سے قبول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بعض خاص محبوں نے جب گھر کے بنائے ہوئے چند کپڑے پیش کئے۔ تو ان کو بھی استعمال فرمایا۔ یوں تو لوگ طرح طرح کے بیش قیمت کپڑے نہایت شوق وخلوص سے ان کے لئے بنوا کر لاتے تھے۔ مگر حضور محض ان کی تسلی کے لئے چند منٹ استعمال فرما کر کسی مسکین ومحتاج کو بخش دیتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جناب غیاث الدین شاہ صاحب نے چھوٹی بھیڑوں کا خودرنگ اون جمع کر کے اپنے ہاتھ سے ایک لوئی آپ کی خاطر

بنوالی۔ اور اس کی تیاری اور احتیاط میں سال سے کچھ زیادہ عرصہ صرف ہوا۔ جب شاہ صاحب نے خاص محبت سے اس لوئی کو پیش کیا تو محض ان کی دلجوئی اور رضا مندی کے لئے استعمال فرمایا۔ جب شاہ صاحب تشریف لے گئے۔ تو اٹھا کر ایک غریب پنڈت کو (جو عام زائرین میں بیٹھا ہوا تھا) عنایت فرمادی۔ عام حاضرین خصوصاً خدام کو نہایت ناگوار گذرا۔ مگر یہاں کسی کو لب ہلانے کی مجال نہ تھی۔

نئے کُرتے یا کپڑے کو استعمال فرمانے کی نسبت پرانے کپڑے کو پیوند لگانا یا مرمت کرنا ان کو زیادہ پسند تھا۔ خلوت نشینی کے عرصہ میں چند ہی جوڑے آپ نے استعمال فرمائے ہیں۔ حالانکہ سالانہ سینکڑوں نفیس اور عمدہ پارچات ان کی خدمت میں پیش ہوتے تھے۔ مگر وہ مسکینوں کو دے دیتے تھے۔ رنگدار نازک، چمکدار، پارچوں سے ان کو کلی نفرت تھی۔ کبھی اس قسم کا کپڑا آپ نے زیب تن نہیں فرمایا۔

خلوت کدہ میں تختے بچھے رہتے تھے۔ اس تختہ پوش کو کبھی قیمتی اور نفیس فرش سے آراستہ نہیں ہونے دیا۔ صرف ایک بوریا اور کھیش اور آخری ایام میں ایک گبہ (توشک) ان کے بستر ے کی آرایش تھی۔ اس سے زیادہ تکلف پسند نہیں فرمایا۔ ارادتمندوں و معتقدوں نے ان کے بستر ے کے لئے اچھے اچھے کپڑے از قسم قالین، نمدہ، گبہ پیش کئے تھے۔ مگر یہاں ان چیزوں کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔

آنکس کہ ترا بخواست جان را چہ کُند
فرزند و عیال و خانمان را چہ کُند
دیوانہ کنی و ہردو جہانش بخشی
دیوانہ تو ہر دوجہان را چہ کُند

کسی شخص نے حضرت اقدس کو باقاعدہ سوتے نہیں دیکھا۔ جن ایام میں دروازہ کھلا رہتا تھا۔ رات دن وہاں میلہ رہتا تھا۔ دن کے علاوہ لوگ رات کے مختلف اوقات میں پہنچکر زیارت سے مستفیض ہوجاتے تھے۔ یہ سلسلہ چوبیس گھنٹہ میں دس منٹ کے لئے بھی منقطع نہیں ہوتا تھا۔ جناب غیاث الدین شاہ صاحب ہمیشہ رات کے وقت ہی یہاں آیا کرتے تھے۔ اور خاص طور پر صبح کی روشنی نمودار ہونے سے پیشتر ہی واپس چلے جاتے تھے۔ ان کا قول ہے میں نے تمام عمر میں کوئی ایسی رات نہیں دیکھی۔ جبکہ میں وہاں نہیں پہنچا اور حضرت اقدس چراغ جلا کر نہ بیٹھے ہوں۔ حالانکہ میں ہمیشہ رات کے مختلف اوقات میں وہاں پہنچتا رہا۔

جب حضرت سُلطان الفُقرا ء نے گوشہ نشینی اختیار کی۔ تو بہت جلد آپ کی شہرت تمام کشمیر میں پھیل گئی۔ اور عام لوگوں نے بکثرت آنا شروع کیا۔ قبل ازیں ذکر کر آیا ہوں۔ کہ آپ کے عمومی صاحب بلکہ روحانی والد جناب رحمہ شاہ صاحب قلندر نے ان کی تولید سعید پر پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا درجہ کمال پر پہنچ کر اپنے عہد میں سُلطان الفُقرا ء کے لقب سے مشہور

ہوگا۔ پس یہ پیشنگوئی اس طرح صادق ہوئی کہ حضرت اقدس کا لقب عام لوگوں کی زبان پر ''بادشاہ'' مشہور ہوگیا۔ اور اس لقب نے یہاں تک مقبولیت اختیار کی۔ کہ اکثر لوگ آپ کے اصل نام سے ناواقف ہوگئے۔ ہر فرد بشر بلا تمیز ہندو مسلم، عالم و جاہل، زن و مرد، خورد و کلاں آپ کو اسی لقب سے یاد کرتا تھا۔ کشمیر کے ہر گوشے سے ہر طبقہ و ملت کے لوگ مثلاً علماء مشائخ، مفتیان و واعظان، ارباب حکومت رؤسا و جاگیردار، عام زمیندار، اہل تجارت۔ اہل طوائف غرض تمام خاص و عام یہاں آیا کرتے تھے۔ اکثر یورپین سیاح بھی ملاقات کے لئے آئے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ چند ایک نے آپ کے فوٹو بھی لئے ہیں۔

ایک دفعہ جب راقم صبح کے وقت صفا پور پہنچا تو حضرت اقدس سیر کوہسار کو تشریف لیجا چکے تھے۔ انتظار واپسی میں لازمی طور پر ٹھہرنا پڑا چونکہ مجھے عدیم الفرصتی کے باعث جلدی واپس جانا تھا۔ زیادہ دیر کے اضطراب سے میرے دل میں طرح طرح کے خیالات و توہمات پیدا ہوئے اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ کیا وجہ ہے کہ حضرت اقدس خود پہاڑ پر تشریف لے جاتے ہیں۔ اور جو لوگ دور دراز مقامات سے آپ کے دیدار کے لئے یہاں آتے ہیں۔ ان کو انتظار کے عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ میں انہی پریشانیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ آنحضور پہاڑ کی طرف سے خراماں خراماں تشریف آور ہوئے۔ عام لوگوں کا شور جب کسی قدر کم ہوا تو راقم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

"ہم نے دنیا سے قطع تعلق کیا تھا۔ اور اہل دنیا سے بیزار ہوئے تھے۔ ویران اور سنسان پہاڑ کو اپنی قیام گاہ پسند کیا تھا۔ لیکن لوگوں کی آہیں اور فریاد و نالے کمندوں کی صورت اختیار کر کے مجھے پہاڑ کے اوپر سے اُتار لاتے ہیں۔ اور مجھے لاچاراً پھر آبادی میں آنا پڑتا ہے"۔

دروازہ بند رہنے کی خبر بہت جلد ملک میں پھیل جاتی تھی۔ سرینگر یا دیگر دور دراز مقامات سے صفاپور جانے والے شخص کو گھر سے نکلتے ہی یہ خبر مل جاتی تھی کہ "بادشاہ" حضرت سُلطان الفُقرا ء نے اتنے دنوں سے دروازہ بند فرمایا ہے۔ یا فلاں وقت سے دروازہ کھلا ہے۔ رئیس اور اُمرا و اہلِ ثروت کی نسبت غریبوں اور مسکینوں اور بے بضاعت لوگوں کے ساتھ زیادہ الفت کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اور ان کے رنج و تکالیف کی داستانیں نہایت شوق اور ہمدردی سے سنتے تھے۔

موجودہ فرمانروائے کشمیر سری سرکار دولتمدار سری مہاراجہ پرتاب سنگھ صاحب بہادر بالقابہ کے خاندان کو قدیم سے فقرا و اہل باطن سے لگاؤ رہا ہے۔ جیسا کہ مہاراجہ سری رنبھیر سنگھ صاحب بہادر آنجہانی اور رسول شاہ صاحب قلندر لاری کی ملاقات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موجود والیٔ کشمیر بھی فقراء اور بزرگوں کی صحبت و ملاقات کو نہایت مبارک سمجھتے ہیں۔ بلکہ حضور ممدوح بذات خود بھی ایک اچھے بزرگ اور دیوتا و مہاتما ہیں۔ جب ان کے دربار تک حضرت سلطان الفقرا کی خبر پہنچی تو انہوں نے ایک دفعہ بمقام قاضی باغ

کنار مانسبل جہاں آپ بغرض سیاحت مقیم تھے۔ ملاقات کی خواہش فرمائی اس وقت حضرت اقدس سیر کوہسار میں مشغول تھے۔ ہر چند آدمی تلاش میں گئے مگر کوئی پتہ نہ ملا۔ دوسری دفعہ سرکار ابد پائدار نے بمقام ''تُلہ مولہ'' ملاقات کی خواہش ظاہر فرمائی۔ اس دفعہ حضرت سلطان الفقراء خلوت کدہ خاص میں رونق افزا تھے۔ اور دروازہ کھلا تھا۔ خدام نے والیٔ ملک کی تشریف آوری کی اطلاع سنکر مکان کی صفائی اور فرش کا انتظام شروع کیا۔ جب حضرت اقدس کو معلوم ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ''ایسے بادشاہوں کی ہم غریبوں کے ساتھ کیا نسبت۔ ہم گدائے گوشہ نشین۔ وہ بادشاہ باتمکین۔ جاؤ کہو کہ واپس تشریف لے جائے۔ اور اپنا کام کرے۔ میں ان کا دعا گو ہوں۔ اور ان کی نیک کاری سے خوش ہوں''۔ اہلکاروں نے بپاس خاطر سرکار والا جاہ عرض کیا کہ آج بھی حضرت شاہ صاحب کوہ ہلدر پر تشریف لے گئے ہیں۔ اس لئے ملاقات نہیں ہوئی۔

حضرت سُلطان الفُقراء کو عہد طفولیت سے سماع کا شوق دامنگیر تھا جیسا کہ آپ کے پیشہ شالبافی کے باب میں ذکر ہو چکا ہے۔ جوں جوں مستی واستغراق کا غلبہ بڑھتا گیا۔ اس شوق میں بھی روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اکثر سرینگر وغیرہ کے قوال آکر گانا سناتے تھے۔ اور دو دو تین تین دن تک سماع کی مجلسیں منعقد رہتی تھیں۔ بعض اوقات خود بھی ستار بجاتے تھے۔ اور اکثر یہ فارسی غزل پڑہا کرتے تھے۔

برمن نظر کن اے صنم، چون عاشق روئے تو ام
عمرے برائے یک نظر سرگشتہ در کوئے تو ام
روزانہ گفت و گوئے تو، شبہا طوافِ کوئے تو
آشفتہ ہمچون موئے تو، مایل بہ گیسوئے تو ام
گاہے بہ نازم مے کُشی، گاہے بہ دارم مے کشی
خوئے تو باشد این چنین، من کشتۂ خوئے تو ام
پیر وضعیف و ناتوان، افتادہ چون ابن یمین
خم گشتہ ہمچون ماہِ نو، مایل بہ ابروئے تو ام

جس کمرہ میں حضرت اقدس نے زمانہ عزلت نشینی بسر فرمایا۔ وہ نہایت صاف اور پاکیزہ رہتا تھا۔ آخر اسی کمرہ میں جام بقا بھی نوش فرمایا۔ اور اسی خلوت کدے کو آپ کے آخری غسل کا فخر حاصل ہوا چونکہ انہوں نے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں فرمایا تھا۔ اس لئے ان کا مسند خالی رکھا گیا۔ یہ کمرہ بدستور بند ہے۔ اور فرش اسی طرح پڑا ہے۔ ان کی چیزیں مصلّٰی ستار، عصا، منقل آہنی، تبرزین اسی کمرہ میں محفوظ ہیں۔



کشف وکرامات وخرق عادات

کار پاکان را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اہل باطن اور اولیائے اللہ سے وقتاً فوقتاً ہمیشہ کارہائے مافوق الفطرات ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ جن کو اسلامی اصطلاح میں کشف وکرامات ماخرق عادات کہتے ہیں۔ دنیا کی تاریخیں عموماً اور اسلامی تاریخیں خصوصاً ایسے حیرت انگیز واقعات سے پُر ہیں۔ گو اہل تحقیق اور صاحبان بصیرت ومعرفت کے نزدیک کشف وکرامات ہی معیار ولایت اور خاص الخاص ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ ان کے آگے خرقِ عادات قصر ولایت کا پہلا زینہ ہے۔

عہد حاضرہ میں سائنس اور فلسفہ جدید کے عقید تمند ایسی باتوں کے قطعی منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قوانین قدرت بدل نہیں سکتے۔ دوسرا ایک مختصر گروہ ایسا بھی موجود ہے جو تذبذب کی حالت میں ہے جب ہوائے الحاد اُنکے مادہ پرست دماغ پر غلبہ کرتی ہے تو وہ فلسفہ کے دعویداروں کے ہم

آہنگ بن جاتے ہیں۔ اگر کسی وقت واقعات ان کو ایسی باتوں کے ماننے پر مجبور بھی کرتے ہیں۔ تو ناچار یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ عہد گذشتہ کے کارنامے ہیں وہ برگزیدہ ہستیاں یہ کمالات ساتھ لے گئیں۔ دور حاضرہ میں ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔

حریفان بادہ ہا خوردند و رفتند
تہی خُم خانہ ہا کردند و رفتند

لیکن ہم چودوی صدی ہجری کے ایک الوالعزم انسان کے کارنامہ ہائے زندگی ان کے پیش کرکے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ۔

ہنوز آن ابرِ رحمت دُرفشان است

یوں تو اہل بصیرت کی نگاہ میں حضرت سلطان الفقرا کے حالات زندگی تمام کمال وکرامات سے مملو ہیں۔ مزید براں ہزاروں کی تعداد میں کشف وکرامات ان سے ظاہر ہوئے ہیں۔ اگر ان کو بالتفصیل درج کرینگے۔ تو یہی باب سالم کتاب کے حجم سے کہیں زیادہ بڑھ جائیگا، پس اختصاراً ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر یہاں چند کراماتیں لکھی جاتی ہیں۔ پیشتر اس کے کہ اصل مطلب شروع کیا جائے۔ یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ حضرت اقدس کے پاس زیادہ تر مایوس العلاج بیمار، مدقوق، مفلوج، مسلول، مجذوم وغیرہ وغیرہ حکیموں اور ڈاکٹروں سے مایوس ہوکر آیا کرتے

تھے۔ یہاں ان کو عام لنگر خانہ سے کھانا دیا جاتا تھا۔ حضرت اقدس کی ایک نظر یا کوئی نیم خوردہ چیز یا دست مبارک کا ملنا یا زبان مبارک کا ارشاد برسوں کے لاعلاج بیماروں کو گھنٹوں میں صحت کامل بخشتا تھا۔ ایسے صدہا تعجب انگیز واقعات راقم نے بچشم خود دیکھے ہیں تاہم بخوف طوالت صرف چند کرامات حوالہ قلم کی جاتی ہیں۔

(۱)

ایک دفعہ حضرت اقدس بہ تقریب سیر و سیاحت موضع ملک چاڈورہ میں رونق افروز ہو کر رجب ڈار کے گھر شب باش ہوئے۔ رات کو چند قوال[۱] (بھگت) ساز و ستار لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سماء شروع ہوا۔ رات کے دو بجے عین جوش کے عالم میں قوالوں نے یہ غزل پڑھنی شروع کی ۔

منزل عشق است اینجا درس مکتب خانہ نیست
جز و مِ تسلیم اینجا قصّہ و افسانہ نیست
بادہ نوشانِ محبت را خمار آخر نشد
ہوش را گوش است اینجا نوش را پیمانہ نیست

۱۔ اِس واقع کو غلام محمد بھگت (بانڈ) سردار بھگتان موزع ہانجی گونڈ بیان کرتا ہے۔ جو خود قوالوں کے ساتھ شامل تھا۔ یہ شخص ابھی موجود ہے۔

عین موقع پر چراغ تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے ٹمٹمانے لگا۔ اہل خانہ سے تیل مانگا تو معلوم ہوا تیل گھر میں موجود نہیں ہے۔ یہ سنکر حضرت اقدس نے لوٹا اٹھا کر چراغ میں پانی ڈال دیا جس سے طلوع آفتاب تک دیا جلتا رہا۔ اور مجلس سماع خوب رونق پر رہی۔

(۲)

ایک[۱] دفعہ حضرت اقدس کے حضور میں چند خدام اور اہل حاجات بیٹھے تھے۔ خلوت کدے کا دریچہ بھی کھلا تھا۔ اسی اثنا میں ایک بلبل دریچہ پر بیٹھ کر غیر معمولی نالہ وفریاد کرنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد دریچہ سے اُتر کر حضرت اقدس کے دامن کے قریب شور وغل کرتا رہا۔ اور ساتھ ہی اپنے پروں کو اس طرح ہلانے لگا کہ گویا وہ اظہار عاجزی کر رہا ہے۔ اور بحیثیت ایک مظلوم کے پناہ مانگتا ہے۔ آنحضور نے حاضرین میں سے ایک شخص کو انگشت مبارک سے ایک طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان ہمسایہ مکان والوں نے اس بلبل کا ساتھی ایک برتن کے نیچے قید کر رکھا ہے۔ جاؤ اس کو وہاں سے چھڑاؤ۔ ارشاد کے مطابق وہ شخص اس گھر کی طرف چلا گیا اور فریادی بلبل بھی اُڑتا ہوا ساتھ ہو گیا۔ وہاں جا کر اصل واقعہ دریافت کرنے پر بالکل صحیح معلوم ہوا چنانچہ وہ اسیر بلبل آزاد ہو کر اپنے ساتھی کے ساتھ خوش وخرم اُڑتا چلا گیا۔

---

۱ اس واقعہ کو پیر نورالدین شاہ صاحب کھوسہ پوری نے بچشم خود دیکھا۔ اور دو تین شخص اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔ جو ب[illegible] موجود ہیں۔

(۳)

علاقہ بانڈی پور کشمیر کا ایک باشندہ کپڑوں کی تجارت کر رہا تھا۔ ایک دفعہ اس نے بہت سی بزازی از قسم کشمیرہ چھیٹ وغیرہ پنجاب سے منگوا کر اپنے کسی معتبر کے ذریعہ فروخت کے لئے گلگت بھیجدی۔ کچھ عرصہ کے بعد اسکو وہاں سے اطلاع ملی کہ اس کا بہت سا مال منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی دریا برد ہوگیا ہے۔ پس یہ شخص پریشان خاطر ہوکر حضرت سلطان الفقراء کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور بچشم اشکبار اپنی سفید پوشی اور عیالداری و اخراجات کے حالات عرض کرنے لگا۔ آنحضور نے فرمایا کہ "جاؤ تمہارا مال دریا برد نہیں ہوگا۔ دریا کو کہد ینگے کہ مال واپس کردے" تاجر یہ نوید جاں بخش سنکر گھر چلا گیا۔ دوسرے روز بذریعہ تار اس کو خبر پہنچی کہ مال دو میل کے فاصلہ پر دریا سے صحیح وسالم نکالا گیا۔ اب تاجر کو یہ فکر دامنگیر ہوئی۔ کہ اگرچہ مال دریا سے مل گیا ہے۔ لیکن وہ خراب ضرور ہوگیا ہوگا۔ اس کا رنگ بھی بگڑ جائیگا اور موسم گرما ہونے کے باعث بوسیدہ بھی ہوجائیگا۔ بزازی کے بنڈلوں کو کون کھول کر سکھائیگا۔ اور شہر کی سرائے میں نہ معلوم کہ یہ مال کس قدر عرصہ تک بند پڑا رہیگا۔ ان تفکرات میں مبتلا ہوکر وہ پھر رحیمی دربار میں حاضر ہوا۔ حضور اقدس نے فوراً پانی منگوایا اور گلگت کی طرف رخ کرکے اُسے نوش فرمالیا۔ پھر تاجر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "پانی کی کیا طاقت ہے کہ

وہ ہمارے مال کو خراب کرے۔ فکر مت کرو۔ مال صحیح و سلامت ہے۔ اس کے بعد یہ تاجر خود گلگت گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے مال کو اپنے ہاتھ سے کھولا تو سب مال صاف اور درست نکلا۔ قیمت میں بھی کوئی نقصان نہ ہوا۔

(۴)

سرینگر کا ایک[1] شخص کشمیر کے اُونی پارچات لوئی، پٹی وغیرہ کا مال ہر سال پنجاب لیجا کر فروخت کرتا تھا یہ تاجر جناب غیاث الدین شاہ صاحب کے عقیدتمندوں میں تھا۔ ہنوز، حضرت سلطان الفقرا کے دیدار سے بہرہ ور نہیں ہوا تھا۔ مگر نام پر شیدا تھا۔ ایک دفعہ موسم سرما میں پٹی وغیرہ مال لیکر روانہ پنجاب ہوا۔ امرت سر میں ابھی اس نے تھوڑا سا مال فروخت کیا تھا کہ اتفاقاً کشمیری مال کی قیمت میں کمی ہو گئی۔ تاجر مذکور کو سرد بازاری سے تردد ہوا۔ آخر نہایت غمگین ہو کر شام کے وقت امرت سر کے باہر ایک میدان میں چلا گیا۔ اور وہاں پر بکمال عجز و زاری و خضوع و خشوع صفا پور کشمیر کی طرف رخ کر کے حضرت اقدس کا تصور باندھ کر اپنے نقصان اور خرابی کا حال زار عرض کرنے لگا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آ کر سو گیا۔ حضرت اقدس عالم رویا میں جلوہ گر ہوئے۔ اور فرمایا کہ "گھبراؤ مت میں علی الصبح خود آ کر تمہارا مال خرید لونگا، چنانچہ صبح کے وقت ایک پٹھان سرائے مذکورہ میں داخل ہو کر

[1] اِس شخص کے پسران رحمٰن جو۔ احد جو۔ امیر اکدل سرینگر میں درزیوں کی دوکان چلا رہے ہیں۔

سیدھا اسی تاجر کے کمرہ میں آیا۔ اور مال کا خریدار ہوا کشمیری تاجر نے مال دکھایا۔ اور قیمت حسب منشاء بیان کی۔ مختصر یہ کہ پٹھان نے بیان کردہ نرخ پر بلا کسی بحث و مباحثہ کے سب مال خرید لیا۔ سرائے مذکورہ میں اور بھی اکثر تاجران ایسے اُترے ہوئے تھے۔ جن کے پاس توجہ سرد بازاری مال پڑا ہوا تھا۔ مگر اس پٹھان نے کسی کی طرف مطلق خیال نہ کیا اور چلا گیا۔ ادھر اس روز حضرت اقدس نے ایک دن پہلے سے ہی دروازہ بند فرمایا تھا۔ دوسرے دن دس بجے کے قریب جب دروازہ کھولا تو فرمایا کہ "میں بہت ہی تھک گیا ہوں۔ ابھی بہت سا مال خرید کر کے امرت سر سے آ رہا ہوں"۔ خدام نے یہ دن اور قمری تاریخ یاد رکھی۔ جب وہ تاجر پنجاب سے واپس آیا تو اس نے تمام ماجرا جناب شاہ صاحب کے گوشگذار کر کے آنحضور کی قدمبوسی کی تمنا ظاہر کی۔ چنانچہ جب وہ دیدار فیض آثار سے بہرہ یاب ہوا تو اس نے آن حضور کا حلیہ بالکل خواب کے مطابق پایا۔ جب تاریخ کی تحقیق کی گئی تو یہ دن وہی ثابت ہوا جبکہ حضور اقدس نے اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

(۵)

ایک دفعہ سرینگر کی ایک بازاری عورت (کسبی) جو حسن و جمال میں بے نظیر اور طلائی زیورات و ریشمی پارچات سے آراستہ تھی، حاضر ہوئی اپنی کرتوت کی شرمندگی اور مایوسی نے اسے ذرا دور فاصلہ پر ایک گوشہ میں بیٹھنے

کی اجازت دی۔ حضور اقدس کے رعب روشن ضمیری نے اسکے تمام افعال قبیحہ کا دفتر اس کے آگے کھول دیا۔ جس سے اس کے بدن میں لرزہ پیدا ہوا۔ مگر خلاف توقع آنحضور نے خوئے رحیمی سے کام لے کر اسے اپنے نزدیک بلایا اور نہایت خندہ پیشانی اور مہربانی سے خیر و عافیت دریافت فرمائی۔ ایک طاقچہ سے ایک برتن اُتارا۔ اس میں مرغ کا گوشت پکا ہوا موجود تھا۔ اپنے دست مبارک سے اس عورت کو کھلایا رخصت کے وقت فرمایا کہ

"جاؤ سرینگر، میں بھی ساتھ ہی ہوں۔ اپنے پائجامہ میں ازار بند ڈال دو"۔

عورت کے ساتھی اور حاضرین مجلس اس فرمان کے یہی معنی کر بیٹھے کہ آنحضور نے سرینگر تک اسکو بدکرداری سے ممانعت فرمائی ہے۔ لیکن نتیجہ کچھ اور ہی نکلا۔ یعنی وہ عورت سرینگر پہنچتے ہی فحش پیشہ اور غرفہ نشینی سے بیزار ہوگئی۔ اور نکاح کا ارادہ ظاہر کیا ہر چند خدمتگاروں نے اسے بہت کچھ سمجھایا۔ مگر باطنی کشش نے اس کو اپنے ارادہ نیک سے باز رہنے نہ دیا۔ چنانچہ تھوڑے دنوں کے اندر اندر ہی اس نے ایک شریف الطبع آدمی سے نکاح کر لیا۔ پھر قرآن مجید بھی پڑھا اور صوم و صلوٰۃ کی شدت سے پابندی اختیار کی۔ اب تک محنت و جانفشانی سے خدمت شوہر اور کنبہ پروری میں مشغول ہے۔ پردہ کی ایسی پابند ہے کہ کسی شخص کو معلوم نہیں ہے کہ آیا وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔

(۶)

ایک دفعہ سرینگر کے چند اشخاص ملاقات کے لئے بسواری کشتی صفاپور جارہے تھے۔ جھیل مانسبل کے قریب ان لوگوں نے حضرت سلطان الفقرا کے ملہم غیب اور روشن ضمیر ہونے کا تذکرہ شروع کیا۔ اس جماعت میں صفا کدل سرینگر کے مشہور حکیم خاندان کا ایک نوجوان ممبر حکیم احمد شاہ بھی تھا۔ جو اس سے پہلے رحیمی دربار میں کبھی حاضر نہیں ہوا تھا۔ اس خیال سے اس کے دل میں تردد پیدا ہوا۔ کہ جب حضور اقدس کو غیب دانی میں کمال حاصل ہے اور وہ ایک ہی نگاہ سے انسان کے ماضی و مستقبل پر یکساں عبور پاسکتے ہیں تو ممکن ہے کہ میرے عہد شباب کی غلط کاریاں اور طفولیت کی خرابیاں برملا مجھے سنادیں۔ اور مجھے لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ وحشت اس کے دل میں دمبدم بڑھتی گئی۔ غرض اسی حالت میں لرزتا اور کانپتا ہوا دربار میں پیش ہوا۔ آنحضور اس وقت عام مجمع میں جلوہ افروز تھے۔ حکیم صاحب از روئے شرمندگی لوگوں کے پیچھے ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔ ان کے تمام اعضاء عرق ریز تھے۔ مگر حاضرین میں سے کسی نے اس انفعال کو محسوس نہیں کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قہوہ حضور اقدس کے پیش ہوا۔ آپ نے حکیم

صاحب کو خاص طور پر اپنے پاس بلایا۔ اور قہوہ کی پہلی پیالی انہی کو دی۔ اور فرمایا:

"گھبراؤ مت۔ میرا نام رحیم ہے کردہ را در گذار آئندہ را نگہدار"۔

مرد کامل کسے بود کہ بہ دہر
کار در خورد نام خویش کند

(۷)

ایک سال کشمیر میں ہیضہ کی سخت بیماری پڑی۔ اور بے شمار خلقت راہ ملک عدم ہوئی۔ لوگ اس قدر متوحش ہوئے۔ کہ کوئی کسی کی خبر تک نہ لیتا تھا۔ اسی اثنا میں جناب غیاث الدین شاہ صاحب بھی اپنے مسکن پر بمقام موضع یار کلاں (جو صفا پور سے ۲۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) اسی مرض سے بیمار ہو گئے۔ اور ساتھ ہی ان کی کیفیت دگر گوں ہو گئی۔ یہاں تک کہ کسی کو ان کی زیست کی امید نہ رہی۔ قرب و جوار کے اعزہ و اقارب جمع ہو گئے۔ آخر روحانی سلسلہ کی بے تار برقی نے اپنا کام کیا، عین اسی وقت جبکہ ادھر یہ شور عظیم برپا تھا۔ حضرت سُلطان الفقرا اپنے عزلت کدہ میں تنہا تھے۔ اور دروازہ کھلا تھا۔ آپ نے اُٹھ کر ایک لٹھ کی چادر کو ایک لڑکے کی شکل بنا کر اپنی گود میں اٹھایا اور ٹہلتے ٹہلتے لوریاں دینے لگے۔ اور فرمایا۔ کہ "میرے

غیاث ! میرے عزیز غیاث ! میرے دل نواز غیاث ! میں تم کو ہرگز مرنے نہیں دونگا''۔ اتفاقاً حضرت اقدس کی ایک چھوٹی لڑکی وہاں آن موجود ہوئی۔ شاہ صاحب کا دستور تھا کہ وہ صفا پور جاتے ہوئے اس لڑکی کے لئے کوئی نہ کوئی چیز لے جایا کرتے تھے۔ جب اس لڑکی نے شاہ صاحب کا نام سنا تو متوحش ہوکر ماجرا دریافت کیا۔ آنحضور نے فرمایا کہ ''یہ وہ تمہارا بھائی ''غیاث'' ہے۔ جو مر رہا ہے''۔ لڑکی نے اتنا سنکر زار زار رونا شروع کیا۔ اور سخت شور مچایا۔ اور اس شورش سے وہاں تمام خادم جمع ہوئے آخر حضرت اقدس نے لڑکی کو نہایت اطمینان سے تسلی دی کہ وہ ''ہرگز نہیں مریگا۔'' پس اسی وقت ایک دو آدمی شاہ صاحب کی خبر گیری کے لئے روانہ ہوئے۔ یار کلان پہنچ کر ان آدمیوں نے شاہ صاحب کو سخت علالت کی حالت میں پایا۔ غرض اس صدمہ سے شاہ صاحب تیرہ دن بحالت بے ہوشی سخت بیمار رہے۔

(۸)

خواجہ عزیز ایتو صاحب اوائل عمر میں ایک دفعہ ایک معزز یورپین کے ساتھ گلگت چلے گئے تھے۔ راستہ میں صاحب بہادر نے خواجہ صاحب کو اپنا سیکریٹری بنایا۔ واپسی پر ایک پڑاوٴ کے نزدیک خواجہ صاحب کی نگرانی سے دو گھوڑے معہ اسباب وسامان بھاگ گئے۔ جن میں سے ایک پر خالص نقدی کا کیش بکس اور دوسرے پر کچھ قیمتی سامان تھا۔ بہت سے آدمی ان کی تلاش

میں آگے پیچھے دوڑائے گئے۔ مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ خواجہ صاحب کو سخت تشویش ہوئی۔ اور وہ خود ہی تیز دھوپ میں پڑاؤ سے بہت دور نکل آئے۔ مگر پتہ نہ چلا۔ ادھر دھوپ کی شدت نے اس کو خشک دم کر دیا۔ اور اس مقام سے پانی بھی کوسوں دور تھا۔ اسی پیچ و تاب میں پہاڑ کے اوپر سے خواجہ صاحب نے یہ آواز سنی کہ

"اے میرے عزیز! مت گھبراؤ میں تمہارے گھوڑوں کو گلگت کی طرف سے واپس لا رہا ہوں۔ مال و اسباب صحیح و سلامت ہے۔ تم ذرا نیچے اُتر کر سرد پانی پیو"۔

خواجہ صاحب نے جب اُوپر کی طرف دیکھا۔ تو صرف ایک آدمی پہاڑ کی چوٹی کے اوپر سے کشمیر کی طرف جاتا ہوا نظر آیا۔ پہاڑ کی چوٹی نزدیک ہی تھی۔ آواز اس سے زیادہ نزدیک معلوم ہوئی۔ یہ سنتے ہی خواجہ صاحب ذرا نیچے آئے۔ وہاں پہاڑ کے پہلو سے ایک چھوٹا سا چشمہ بہتا ہوا پایا۔ پانی نہایت سرد و شیریں تھا۔ جس سے خواجہ صاحب کی پیاس اور پیچ مرد گی دور ہوئی واپس آکر خواجہ صاحب نے یہ واقعہ اہل قافلہ سے بیان کیا۔ پانی کی نسبت تو انہوں نے کہا کہ یہاں سے تقریباً چار میل تک کہیں پانی کا نام ونشان نہیں ہے۔ ہم نے ہمیشہ کی آمدورفت میں اس مقام پر نہ کبھی پانی دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کے اصرار پر دو تین آدمی پانی لانے کے لئے دوڑے۔ مگر وہاں کوئی چشمہ وغیرہ نظر نہیں آیا۔ ابھی یہ بحث و مباحثہ ختم نہیں ہوا تھا۔ کہ ایک آدمی گلگت کی طرف سے آتا ہوا ان مفرور

گھوڑوں کو لایا۔ مال واسباب صحیح وسلامت پایا جب خواجہ صاحب کشمیر آکر حضرت اقدس کے دیدار سے مشرف ہوئے۔ تو آنحضور نے فرمایا کہ

"میں بھی سفر کر کے آیا ہوں مجھے گلگت سے گھوڑے واپس لانے پڑے۔ اور ایک سخت پہاڑ سے فرہاد کی طرح نہر نکالنی پڑی۔"

اس واقعہ کو خواجہ صاحب کے علاوہ اکثر آدمی بیان کر رہے ہیں جو ابھی تک موجود ہیں۔

(۹)

علاقہ لار کا ایک زمیندار کچھ عرصہ سے رحیمی دربار میں حاضر ہوتا اور حضرت کے فیوض و برکات سے مستفید ہوتا تھا۔ ایک دن وہ غروب آفتاب کے وقت صفا پور کی طرف روانہ ہوا۔ کوہ ہلدر کے دامن میں دو تین میل تک راستہ بالکل سنسان اور دہشت انگیز ہے۔ شام کے بعد اکیلا مسافر یہاں ڈر جاتا ہے۔ پس حسب معمول یہ زمیندار بھی شام کے وقت یہاں پہنچکر سخت ہراساں ہوا۔ ایک طرف سر بفلک پہاڑ کی مختلف چوٹیاں رات کی تاریکی میں اس کو دیو طلعت نظر آتی تھیں۔ دوسری طرف وہ راستہ کے سناٹے سے خائف تھا۔ صحرائی درندوں اور راہزنوں کا خوف اس کو دامنگیر ہوا۔ آخر اس نے رحیمی دربار کی طرف رجوع کر کے اپنے خوف زدہ دل کو اس طرح

ڈھارس دی کہ یہ وہی پہاڑ ہے۔ جس پر حضرت اقدس ہمیشہ چڑھا کرتے ہیں۔ اسی اثناء میں پہاڑ کے پہلو سے ایک سفید پوش شخص آنکلا۔ زمیندار پہلے تو نہایت ڈرا۔ مگر نزدیک پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت سُلطان الفُقراء ہیں نہایت خوش ہوکر قدموں پر گرا۔ آخر آنحضور صفاپور کی طرف تشریف فرما ہوئے۔ اور یہ بھی خوش وخرم ساتھ ہوا۔ زمیندار نے اس غیر وقت پر ایسی جگہ حضرت اقدس کی ملاقات کو غیر معمولی واقعہ تصور نہیں کیا۔ کیونکہ کوہ ہلدر آنحضور کی جولانگاہ تھی۔ اور اکثر شام کے وقت ہی سیر کوہسار سے واپس تشریف لاتے تھے۔ مختصر آنحضور زمیندار کو ساتھ لیکر اپنے مکان کے باہر کوہل پر پہنچ گئے۔ وہاں ٹھہر کر اس کو حکم دیا کہ

"آپ جاکر فی الحال کچھ خورد ونوش کا انتظام کریں۔
میں بھی وضو کر کے آتا ہوں۔"

جب یہ شخص مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت اقدس نے آج دو دن سے دروازہ بند فرمایا ہے۔ جب وہ واپس کوہل پر آیا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

(۱۰)

ایک دفعہ رات کے وقت جناب غیاث الدین شاہ صاحب بسواری کشتی صفاپور جارہے تھے۔ اور اس کشتی میں اور بھی بہت سے مسافر تھے۔ نصف شب کے قریب جبکہ کشتی دریا کے وسط میں چل رہی تھی۔ ایک کنارہ

سے کسی شخص نے آواز دی۔ کہ او کشتی والے! مجھے بھی کشتی میں بٹھاؤ۔ ملاحوں نے کشتی کنارہ کے ساتھ لگا دی۔ دیکھا تو آواز دینے والا غائب تھا۔ ہر چند دائیں بائیں تلاش کی گئی۔ مگر کہیں انسان کا نام ونشان نہ پایا۔ جب وہ کشتی روانہ ہونے پر تیار ہوئی۔ تو دیکھا کہ کشتی پانی سے پُر ہے۔ اور غرق ہونے کو بالکل تیار ہے۔ آخر پانی نکالا گیا۔ اور وہ سوراخ بھی بند کیا گیا۔ جس کے ذریعہ پانی داخل ہوا تھا۔ بہر حال رات کے چار بجے جناب پیر غیاث شاہ صاحب حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو خلوت کدہ خاص میں ایک موٹا بلم (عصاء) پڑا ہوا دیکھا۔ اس کے نیچے لوہے کی شام بھی لگی ہوئی تھی۔ آنحضور نے فرمایا

"جب کسی وقت کشتی میں پانی آتا ہے اور ڈوب جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو اسی عصاء کے ذریعہ کشتی کو بچاتا ہوں۔ اور کنارہ کی طرف لگاتا ہوں۔"

(۱۱)

تحصیل سری پرتاب سنگھپورہ کے ایک گاؤں کا نمبردار آپ کا خاص معتقد تھا۔ یہ شخص اگر چہ محض غیر تعلیمیافتہ ہے۔ مگر اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اور آنحضور کی صحبت بابرکت نے اس کے وجود پر پورا اثر ڈالدیا ہے۔ جب حضور اقدس کا انتقال ہوا تو اس کو از روئے بے علمی تشویش پیدا ہوئی۔ کہ خدا

جانے میرے مرشد و مولا راہ راست پر تھے یا نہیں۔ اور ان کا انجام کیسا ہوا؟ پس اس نے اسی رات عالم رویاء میں دیکھا کہ پختہ فصل کی گندم کا ایک بہت بڑا کھیت ہے۔ جو کاٹا جارہا ہے۔ کہا گیا کہ یہ کھیت عالم کا ہے۔ اور حضور اقدس فصل اُٹھانے کے مہتمم ہیں۔ خواب دیکھنے والے نے ان سے مصافحہ کیا۔ اس کھیت کے نزدیک ایک عالیشان مکان نظر آیا۔ جس کی نسبت بیان ہوا کہ یہ بھی عالم کا ہی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مکان سے اذان کی آواز آئی تو کہا گیا کہ یہ مسجد ہے۔ جب نماز ادا کرنے کے لئے لوگ داخل ہوئے تو آواز آئی کہ یہی خدا کا گھر (بیت اللہ) ہے۔ اس گھر میں حضرت اقدس کے تمام مرید جمع تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی خلقت تھی جن کو اس نے شناخت نہیں کیا۔ پس حضرت سلطان الفقرا امام ہوئے۔ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ "ار آیت الذی" اور دوسری رکعت میں "سورہ والناس" پڑھی۔ جب نماز دوگانہ سے فارغ ہوئے تو حضرت اقدس ممبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھنے لگے۔ جو حسب ذیل ہے:۔

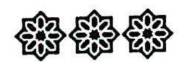
"اَشْهَدُ اَنْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه ______ وَاحِدًا
اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدَ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ"

یہی دو کلمات سنکر خواب دیکھنے والا بیدار ہوگیا۔

اس خواب کی تعبیر سے کما حقہ آگاہ ہونا کسی عالم فاضل یا معتبر کا کام ہے۔ مگر سرسری طور پر خواب دیکھنے والے کو تشفی ہوئی۔ اور توہمات کے گرداب سے اس کے عقیدے کی کشتی نجات حاصل کرکے یقین کے ساحل تک پہنچی۔ اور

اسے ذہن نشین ہوا کہ یہی صراط المستقیم ہے۔ جس پر وہ مدت سے گامزن ہے۔

راقم نے اپنی استعداد و لیاقت کی رُو سے اس خواب کی نوعیت پر ہر پہلو سے غور کیا۔ آخر اس نکتہ پر پہنچا اگر ان آخری کلمات (خطبہ) کے اعداد جمع کئے جائیں تو کیا نتیجہ حاصل ہوگا۔ چونکہ خواب دیکھنے والے کا بیان ہے کہ حضور اقدس نے خطبہ میں پہلا کلمہ ادا فرما کر تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد لفظ "واحد" زبان مبارک سے فرمایا۔ جیسا کہ طرز تحریر سے واضح ہوتا ہے اس بیان کے رو سے ان کلمات کے اعداد کی حاصل جمع ۱۳۳۳ر آتی ہے۔ جس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر لفظ "واحد" کے ساتھ الف کر دیا جائے۔ تو معنی مناسب ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بوجہ اَن پڑھ ہونے کے بیان کرنے والی کی سمعی یا بیانی کمزوری ہو پس اس ایک حرف کی زیادتی سے کُل خطبہ کے اعداد کی جمع ۱۳۳۴ر آتی ہے۔ جس سے حضرت سلطان الفقرا کا سال رحلت مراد ہے۔ اور ارباب نکتہ بین و اہل بصیرت و معرفت کے لئے صاف اشارہ ہے کہ انہی کلمات کی حلت غائی اور اصل مقصد پر اس خطیب کا انجام ہوا۔



حضرت سُلطانُ الفُقرا ءکے چند اقوال

چون سر کنم حدیثِ لبِ لعلِ یار را　　گرد از نہادِ چشم حیوان بر آورم

☆...... فرمایا۔ انسان اور مرغ سحر ایک ہی وقت آرام پذیر ہوتے اور سوتے ہیں۔ اگر رات کے دوسرے حصہ میں انسان مرغ سے پہلے بیدار ہوا۔ تو فی والواقع مرغ سے فضیلت میں برتر ہے۔ اگر مرغ کے ساتھ ہی بیدار ہوا تو دونوں فضیلت میں یکساں ہیں۔ اگر مرغ سحر کی آواز سے انسان بیدار ہوا تو ایسا انسان ضرور مرغ سے فضیلت میں کم درجہ رکھتا ہے۔ اور مرغ اس سے بہتر۔

☆...... ایک دفع حضرت اقدس کے دروازے کے ساتھ دونوں کتّے پاؤں پھیلا کر بیٹھے تھے۔ اور دم ہلا کر حضرت اقدس سے اظہار محبت کر رہے تھے۔ آنحضور نے فرمایا کہ

"پہلے زمانہ[1] میں پانچ یا چھ آدمیوں کو اس قسم کا ایک

---

[1] غالباً یہ اشارہ واقع اصحاب کہف کی طرف ہے۔ واللہ علمہٗ بالصواب۔

رفیق ملتا تھا، مجھ اکیلے کو ہی ایسے دور فیق ملے۔"

☆...... ایک دفعہ رات کے وقت سماع کی مجلس منعقد تھی۔ آنحضور بھی شوق سے سن رہے تھے۔ درمیان میں تھوڑی دیر کے واسطے قوال خاموش ہو گئے۔ حضرت اقدس نے دونوں دست مبارک آسمان کی طرف اُٹھا کر یہ دعا مانگی۔ الٰہی جو ہمارے ہیں وہ دونوں جہان میں سلامت رہیں۔ اور ان کو رنج وآلام سے ایمنی رہے۔ اور جو تیرے ہیں۔ وہ ہمیشہ مبتلائے غم وصدمات رہیں۔ اوران کے وجودوں پر ہزار ہزار آفتیں نازل کر۔

فرمایا "سخت سے سخت بدکار بھی اگر میرے حلقہ میں داخل ہوتا ہے۔ تو اس کو آلائشوں سے ایسا صاف کرتا ہوں۔ جیسے کہ آسمانوں کے ملائک ہوتے ہیں۔"

☆...... فرمایا "دنیا میں پیرومرشد دو قسم کے ملتے ہیں۔ ایک بمنزلہ والد اور دوسرا بمنزلہ والدہ کے ہوتا ہے۔ والد کو اپنے بچے کی ضرور محبت ہوتی ہے۔ اور نہایت پیار سے اس کی پرورش کرتا ہے۔ لیکن حد بلوغ میں آکر اگر باپ کے حکم سے انحراف کرے۔ یا کوئی خراب رویہ اختیار کرنے سے اس کے ہاتھ سے اس کے والد کو کوئی تکلیف پہنچے تو اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ والد اس کو اپنے گھر سے نکال کر ہمیشہ کے لئے وراثت سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ لیکن والدہ کی کیفیت اس سے جدا ہے لڑکا چاہے کتنا ہی نافرمان، بدچلن، ناعاقبت اندیش، نقصان کنندہ کیوں نہ ہو، والدہ اس پر مہربان ہی رہتی ہے۔ اگر کسی وقت ناراض بھی ہو جائے تو وہ

رنجیدگی عارضی ہوتی ہے۔ کسی صورت میں والدہ کو اپنے لختِ جگر کی جدائی ایک لمحہ کے لئے بھی منظور نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکا کسی لہو و لعب یا شغل قبیح میں پڑا ہوا کوچہ گردی میں مصروف ہے تو والدہ طرح طرح کے خوانِ نعمت لے کر اس کے پیچھے پیچھے پھرتی رہتی ہے۔"

☆...... فرمایا "جب کوئی بیمار کسی حکیم یا ڈاکٹر کے پیش ہوتا ہے۔ تو اس کا نظام حیات قایم رہنے کے لئے اسے فاقہ اور پرہیز کی تجویز ہوتی ہے اور اکثر ایسی چیزوں سے اس کو ممانعت کی جاتی ہے۔ جن کا وہ عادی ہوتا ہے یہ پابندیاں چندروزہ ہوتی ہیں۔ اگر بیمار اس تجویز پر کاربند رہا۔ تو صحت یاب ہونے پر ہر ایک چیز استعمال کرسکتا ہے۔ بصورت دیگر تساہل و تغافل سے اس کو موت کا یقینی خطرہ ہے۔ اسی طرح جب کوئی مجرم کسی برے فعل کا مرتکب ہو کر کسی جج کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ تو اس کی اخلاقی صحت کی درستی کے لئے اس کو کچھ عرصہ کے واسطے قید کی سزا ملتی ہے۔ یہ بھی چندروزہ ہوتی ہے بعد انقضائے ایام مقررہ وہ پھر آزاد ہے۔ اگر مجرم انکار یا تعمیل حکم سے انحراف کرے تو اسے حبس دوام یا سزائے موت کے ملنے کا قوی احتمال ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب کوئی سرکاری اہلکار کوئی ناجائز حرکت کرتا ہے۔ یا فرائض منصبی کی انجام دہی میں قاصر ثابت ہوتا ہے تو اعلیٰ آفیسر ایسی کمزوریوں کے دور کرنے کے لئے اس کو کچھ عرصہ معطل کر دیتا ہے۔ اور غلط کاریوں سے منع کرتا ہے۔ بشرط تعمیل حکم وہ پھر اپنے منصب پر آ کر آئندہ زندگی خوشگوار گذار سکتا ہے بصورت دیگر اس کو ہمیشہ کے لئے موقوف کر

دیتے ہیں۔ پس جب کوئی انسان کسی روحانی طبیب یا ڈاکٹر۔ یا روحانی جج یا گورنر (مرشد کامل) کے پاس حاضر ہوتا ہے تو اسے روحانی بیماریوں اور اخلاقی کمزوریوں کی صحت و درستی اور نفسانی آلائشات و آلودگیوں کی صفائی کے لئے اسی قسم کے جوشاندے دیئے جاتے ہیں۔ اگر وہ مریض اِن تجاویز و احکامات کا پابند رہے تو آئندہ کے لئے وہ خود مختار و آزاد ہے۔ اور اپنے اخلاق کاملہ کی وجہ سے وہ انسان کامل کہلانے کا بھی مستحق ہے۔ بصورت دیگر اگر وہ ان تجاویز و احکامات کا پابند نہیں ہوتا بلکہ پہلوتہی اور انحراف کرتا ہے۔ تو اسے موت کی سزا ملتی ہے۔ ایسی موت کو روحانی موت کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ دنیا میں کوئی ذلیل اور حسرتناک موت نہیں ہے۔"

☆...... فرمایا "مرغ بھی خدائے رب العالمین کی عبادت اور بندگی کرتا ہے اور اس کی شہادت اس کی آواز ہے۔ بلکہ وہ وضو بھی کرتا ہے۔ اور سجدہ بھی دیکھو! آواز دینے سے پیشتر اپنے پروں کو اس طرح ہلاتا اور حرکت دیتا ہے۔ جس طرح ایک مصلی ادائے نماز کے لئے تیمّم کے واسطے دست و بازو کو حرکت دیتا ہے۔ اور آواز کے دوران میں پورے عجز و انکسار سے بطریق اثبات اپنے سر کو خم کر کے خالق الارض والسمٰوٰت کے آگے سجدہ کرنے کا اشارہ کرتا ہے۔"

❀❀❀

پیر غیاث الدّین شاہ صاحبؒ کا حلقہ ارادت میں آنا

جناب حضرت غیاث الدّین شاہ صاحب موضع یار کلان[1] کے رہنے والے ہیں آپ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس نے آج تک بڑے بڑے علماء اور فضلاء اور مشائخ پیدا کیے ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار تین لڑکے چھوڑ کر عالم شباب میں ہی رحلت کر گئے تھے۔ شاہ صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ آپ کی عمر ابھی چودہ سال کے قریب تھی کہ آپ کے برادران بزرگ بسلسلۂ سیر و سیاحت گھر سے باہر چلے گئے اور انتظام خانہ داری کا بوجھ آپ پر اور آپ کی ضعیف العمر والدہ پر آپڑا ایامِ زمستان تو جوں توں گذار دیئے مگر جب بہار کا موسم آیا۔ اور لوگ زمینیں آباد کرنے اور فصل بونے کی تیاریوں میں مصروف ہونے لگے تو یہ معصوم و بے کس لڑکا اپنی بیچارگی کی وجہ سے اپنی اراضی بھی آباد نہ کر سکا۔ اس زمانہ میں حکومت جبراً زمینداروں سے زمینیں آباد کراتی تھی۔ جب زمین آباد ہونے

---

[1] سری نگر سے دس میل بطرفِ جنوب چرار شریف کی طرف واقع ہے۔

کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔ تو عمال کے خوف سے آپ والدہ صاحبہ کو تو اس کے بھائیوں کے گھر چھوڑ آئے۔ اور آپ سرینگر کی طرف مزدوری وغیرہ کے لئے روانہ ہوئے اُس وقت گھر میں صرف تین سیر آٹا موجود تھا۔ جس کو آپ نے بطور زادِ راہ ساتھ لے لیا۔ ان دنوں حضرت سلطان الفقرا کا مبارک نام آسمان شہرت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ آپ بھی سرینگر پہنچ کر سیدھے صفا کدل آئے۔ جہاں سے ہر روز شام کے وقت صفا پور کی طرف کشتی جاتی ہے۔ آٹا فروخت کر کے چائے اور مصری خریدی۔ اور ایک آنہ کشتی[ا] کا کرایہ دیا۔ اور طلوع آفتاب سے پہلے ہی دیدار فیض آثار سے مشرف ہو گئے۔ یہ زمانہ حضرت اقدس کی ابتدائے عزلت نشینی کا تھا۔ دروازہ عموماً کھلا ہی رہتا تھا۔ شاہ صاحب کے اندر آتے ہی آنحضور بڑے تپاک سے اُٹھ کر ان سے بغلگیر ہوئے۔ اور پیشانی پر بوسہ دے کر فرمایا کہ "میں نے تم کو زمینوں اور آسمانوں پر ڈھونڈا۔ دشت و بیابان چھان ڈالے۔ تم اس وقت تک کہاں تھے۔ میں تو صرف تمہاری خاطر ہی دنیا میں آیا ہوں۔ کیا تمہارے گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے! کپڑا نہیں ہے! سامان نہیں ہے کیا تمہاری زمین ابھی تک کوئی آباد نہیں کرتا۔ کیا تمہارے بھائی تم کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ کیا تم اپنی والدہ کو اس کے میکے چھوڑ آئے۔ کیا ظلم اور تنگدستی نے تم کو اپنا گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اچھا آج ہی واپس چلے جاؤ۔ تمہاری زمین غیر آباد نہیں رہ سکتی۔ آسمان سے فرشتے آئینگے۔ اور اے معصوم لڑکے وہ آ کر اس

[ا] اس کشتی کا کرایہ آج کل سرینگر سے سنبل تک فی نفر آٹھ آنہ ہے

زمین کو آباد کرینگے۔ اور تمہاری آسائش کے تمام سامان تمہارے پاس بھیجدیئے جائینگے۔"

شاہ صاحب یہ جان افزا باتیں سنکر الٹے پاؤں اپنے گھر واپس چلے آئے۔ ان کو دیکھ کر گاؤں کے باشندوں میں ان سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اور سب نے بالاتفاق ان کی زمین کو آباد کردیا۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے ہفتہ وار (بعض دفعہ ہفتہ میں دوبار) صفاپور جانا مقرر کیا۔ رفتہ رفتہ اس خاک کے پتلے میں جمالِ ہم نشین نے وہ اثر پیدا کیا کہ ذرّہ آفتاب بن گیا۔ اور خاک کیمیاء صفت ہوگئی۔ آپ کی شہرت سُن سُن کر خلق اللہ جوق در جوق آپ کے پاس آتی تھی۔ اور آپ کی نیک صحبت سے مستفیض ہوتی تھی۔ حضرت سُلطان الفُقراء کو آپ سے نہایت محبت تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آپ کے عاشق تھے۔ اور دو تین یوم سے زیادہ آپ کی مفارقت گوارا نہ کرسکتے تھے۔ آپ کی طرف حضرت اقدس کا زیادہ میلان دیکھ کر بعض خام طبع لوگوں کو رشک پیدا ہوا۔ آنحضور نے اس شر کو مٹانے کے لئے شاہ صاحب کو رات کے وقت حاضری کا حکم دیا۔ چنانچہ شاہ صاحب ہمیشہ اسی ارشاد کے پابند رہے۔ شاہ صاحب کے واسطے کبھی دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔ گھنٹوں تخلیہ میں راز و نیاز کی باتیں ہوتی تھیں۔ شاہ صاحب نے بھی متابعت و فرمانبرداری پیر میں وہ کمال دکھایا جسکی نظیر عہدِ حاضرہ میں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کبھی ان کے حکم سے انحراف نہیں کیا۔ ایک پانی کا گھونٹ بھی بلاحکم نہیں پیا۔ یہ وطیرہ ان کا کچھ آنحضور کے سامنے ہی نہیں رہا۔ بلکہ ہر حالت میں ہر جگہ تابع فرمان رہے۔ تقریباً بیس سال تک شاہ

صاحب اپنے گھر سے صفا پور تک پیدل جاتے رہے۔ جب حضرت سلطان الفقرا نے اجازت دی کہ آپ گھوڑے پر آیا کریں۔ تو آپ نے پیدل آنا چھوڑ دیا۔ مگر بہ پاس ادب صفا پور سے چند میل دور ہی گھوڑا رکھتے تھے۔ بسا اوقات ایسا بھی دیکھا گیا۔ کہ شاہ صاحب سرینگر میں کسی معزز شخص کے ہاں مدعو ہیں۔ اور ان کے لئے طرح طرح کی نعمتیں تیار ہوئی ہیں۔ اور اچھے اچھے لوگ محفل میں ہم صحبت ہیں۔ اور ساز و سرود کا شغل گرم ہے۔ دفعتاً شاہ صاحب کو کچھ خیال آیا۔ اور آپ صفا پور جانے کے لئے بے قرار ہو گئے۔ ہم صحبت دوسرے دن پر ارادہ ملتوی کرانا چاہتے ہیں۔ صاحب دعوت عجز و زاری کر رہا ہے کہ اور کچھ نہ سہی تو آپ کوئی چیز ہی تناول فرما جائیں۔ مگر باطنی کشش ایسی زبردست ہے۔ کہ ایک بات بھی منظور نہیں ہوتی۔ باوجودیہ کہ باہر سخت سردی ہے۔ اور بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ رات کے دس بج گئے ہیں۔ ہر گلی کوچہ ظلمت کدہ نظر آرہا ہے۔ کوئی کشتی والا اس وقت روانگی کا زمہ نہیں لیتا۔ گھوڑا بھی حاضر نہیں ہے۔ راستہ بھی خطرناک ہے۔ مگر شاہ صاحب اسی حالت میں اسی وقت بلا خورد و نوش صفا پور روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ کسی اور شخص کو بھی ساتھ نہیں لے جاتے۔ اللہ اللہ کیا شوق ہے اور کیا جذبہ ہے۔

اے زخود رفتگئے شوق غریب الوطنی
جانتی ہے کہ مجھے گھر سے نکالا کس نے

ادھر حضرت سلطان الفقرا کا بھی یہ حال ہے کہ آپ کو دیکھتے ہیں۔

اور زبان حال سے فرماتے ہیں۔

چرا با غیر بنشینی نشانِ آشنا داری   مشو دور اے عزیز من بیا نزدیک ما بنشین

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سلطان الفقرا نے صرف شاہ صاحب کی کوشش سے ہی خورد و نوش اور لباس کی طرف رجوع فرمایا۔ شاہ صاحب زیادہ تر سیر و سیاحت میں ہی رہتے تھے۔ اگر پچاس میل کے فاصلہ پر بھی ان کو کوئی اچھی چیز نظر آتی تو وہ حضرت اقدس کی خدمت میں لا کر پیش کرتے تھے۔ آنحضور کو بھی جس قدر وابستگی اور محبت شاہ صاحب کے ساتھ تھی۔ اس کا احاطہ تحریر میں لانا دشوار ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ شاہ صاحب ایک دنیاوی معاملہ میں متفکر تھے اسی حالت میں حاضر دربار ہوئے۔ حضور اقدس اس وقت ستار بجا رہے تھے جب شاہ صاحب آئے تو ستار ان کے ہاتھ میں دیدی۔ اور فرمایا بجاؤ۔ شاہ صاحب نے بجانا شروع کیا۔ اور کشمیری زبان کی ایک غزل پڑھی۔ جب اس بند پر پہنچے۔

کشمیری

ژٕنے کیاہ دُیت تھَم مےٚ وعدٕ   بو   ترٛوتھَس   اُفتادٕ
روا چھا نگھٕ وأتتھ   دَکٕہ   لاٮ۪ن   خامسے

اردو ترجمہ

”آپ نے میرے ساتھ کیا وعدہ کیا تھا۔ اب مجھے گرا کر چھوڑ

گئے۔ کیا یہ شایان ہے کہ نزدیک پہنچ کر کچے کو دکہ دینا۔“

تو سنتے ہی حضور اقدس نہایت جوش میں آئے۔ اور شاہ صاحب کے گلے لپٹ گئے۔ اور فرمایا کہ

”تم میرے جان و جگر ہو۔ کونسی بات ہے جس سے تم متاثر ہو کر ایسا کہنے پر مجبور ہوئے ہو مجھے عالم وجود میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو قدرت کا مشتاق تھا۔ محض تیری خاطر دنیا میں آیا ہوں“۔

غرض دو تین یوم کے اندر ہی شاہ صاحب اس فکر سے آزاد ہو گئے۔

موضع صفاپور کے قریب جھیل مانسبل کے جنوبی دامن میں ایک ٹیلہ ہے جس کو اَہَہ ٹینگ کہتے ہیں۔ یہ ٹیلہ مفصلات کشمیر میں دور دور تک نظر آتا ہے۔ شاہ صاحب اگرچہ سیلانی طبیعت رکھتے ہیں۔ مگر زیادہ دُور علاقوں میں ان کو جاتے نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ راقم نے وجہ دریافت کی تو فرمایا میں صرف اس جگہ تک جانا پسند کرتا ہوں۔ جہاں سے وہ صفاپور کا ٹیلہ (اَہَہ ٹینگ) صاف نظر آتا ہے۔ حضور اقدس کی حیات مجازی میں شاہ صاحب اکتیس سال تک وہاں جاتے رہے۔ آج کل بھی بدستور اسی طرح وہاں جایا کرتے ہیں۔ شروع سے ان کا طریقہ تھا کہ وہ سال بھر کے متبرک دن اور متبرک راتیں مثلاً یوم عاشورہ، یوم مولود، اول ماہ رمضان المبارک، یوم وفات حضرت پیر پیرانؒ، یوم وفات حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ۔ لیلتہ الراغب، لیلتہ المعراج، لیلتہ البرات، لیلتہ القدر وغیرہ وغیرہ حضور اقدس کے

پاس ہی گذار آتے تھے۔ اب بھی اسی طرح اِس طرزِ عمل کے پابند ہیں۔ اور ایسے پابند ہیں کہ ۲۸ سال میں کبھی اس میں فرق نہیں آنے دیا۔

اگرچہ حضور اقدس نے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں فرمایا ہے۔ مگر حاشیہ نشینان بزم رحیمی ہر ایک معاملہ میں شاہ صاحب کو ہی اپنا پیشوا اور حضرت سلطان الفقرا کا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ جلسہ سالانہ بھی اِنہی کے زیر اہتمام ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے دروازہ پر بڑے بڑے رئیس اور اہل ثروت آتے ہیں۔ مگر وہ ایسے لوگوں کے ملنے کی بجائے غریبوں کے ساتھ زیادہ محبت وشوق سے ملتے ہیں۔ کسی سے کوئی چیز نہیں مانگتے۔ دنیاوی جاہ وحشمت کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ اپنی زمین خود آباد کرتے ہیں۔ اور اپنے گھر میں سالانہ دو تین لوئیاں بناتے ہیں۔ جو بہت عمدہ اور قیمتی ہوتی ہیں۔ انہی لوئیوں قیمت سے اخراجات خانگی سال بھر کے لئے پورا کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ چاہیں تو بہت کچھ جمع کر سکتے ہیں۔

آپ کے پاس روحانی بیماروں کے علاوہ دنیاوی بیمار بھی آتے رہتے ہیں۔ اور آپ عموماً ان کو ایک قسم کے غسل کی ترکیب بتاتے ہیں۔ راقم نے ایک دفعہ ہیضہ کے اکثر بیماروں کو اسی طرز سے ان کی ہدایت وتجویز کے مطابق صحت یاب ہوتے دیکھا ہے۔

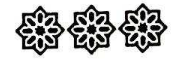


سردار دریام سنگھ تحصیلدار ریاست کشمیر کا مُشرّف بہ اِسلام ہونا

ضلع اَمرتسر پنجاب کا ایک رئیس زادہ نوجوان سردار دریام سنگھ کشمیر میں تحصیلدار تھا۔ یہ شخص انتہا درجہ کا تندمزاج۔ خود پسند، ظالم تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص نے اس کی سخت گیری اور ستم رسانی کی شکایت کی۔ آنحضور نے فرمایا کہ عنقریب اس کو یہیں بلائینگے۔ کچھ عرصہ کے بعد اشارہ غیبی سے سردار دریام سنگھ رخصت لے کر معہ سامان و خدمتگاران حضرت سلطان الفقرا کے دروازہ پر حاضر ہوا۔ خدام درگاہ نے خلوت خانہ کے نزدیک سردار صاحب کے ٹھہرنے کے لئے ایک کمرہ خالی کر دیا۔ جس میں اس نے تین ماہ دس یوم (۱۰۰ ریوم) کا ایک چلہ پورا کیا۔ سردار صاحب کو ریشمی پلنگ۔ نفیس پار چات۔ اور مخملی تکیوں پر سر رکھ کر دن کے دس بجے تک سونے کی عادت تھی۔ حضور اقدس کی نگاہ کیمیا اثر نے وہ کام کیا کہ اب سردار صاحب بسترِ استراحت کو ایک طرف چھوڑ کر ساری ساری رات یا دخدا میں مشغول

رہنے لگے۔ اگر کسی وقت نیند غلبہ بھی کرتی تھی۔ تو اپنا ہاتھ سرہانے رکھ کر خالی زمین پر چند منٹ آرام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ نوکروں کو بھی رخصت کیا۔ اور سامان عشرت خدا کے نام پر خیرات کر دیا۔ سردار صاحب عمر کے بقیہ ایام زندگی حضرت سلطان الفقرا کے قدموں پر بسر کرنا چاہتے تھے۔ مگر آنحضور نے کسی مخفی اور باطنی وجہ سے ان کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ اب سردار صاحب جو مسلمان کامل اور عارف باللہ کی حیثیت میں جاہ وحشمت اور حکومت ظاہری سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ مستعفی ہو کر پنجاب چلے گئے ہیں۔

سنا جاتا ہے کہ سردار صاحب موصوف آج کل خواجہ غریب نواز جناب حضرت خواجہ معین الدّین صاحب اجمیری سنجری چشتیؒ کے مزار پُرانوار پر گوشہ نشین ہیں۔



حضرت سُلطانُ الفُقرا اور صحرائی درندے

بلّی:

ایک دفعہ موسم سرما میں جبکہ برف کی سفید چادر کوہ و بیابان پر بچھی ہوئی تھی۔ اور ''زمین ہم سفید و فلک ہم سفید'' کا نظّارہ پیش نظر تھا کوہ ہلدر کی طرف سے سیاہ رنگ کی بلّی جو عام بلیوں سے رنگ و جسامت میں علیحدہ تھی۔ حضور اقدس کے دربار میں حاضر ہوئی۔ تھوڑے دن کے بعد ایک بچہ کو جنم دے کر مر گئی۔ اور وہ بچہ دربارِ حضوری میں پرورش پاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اچھی بلی بن گئی۔ آنحضور خوب اس کو کھلاتے پلاتے تھے۔ رات کو ان کے قریب آکر سوتی تھی۔ سیر کوہسار پر یہ بلی قیام گاہ خاص اور خلوت کدہ کی حفاظت کرتی تھی۔ آنحضور کی عدم موجودگی میں کسی شخص کو اندر داخل ہونے نہیں دیتی تھی۔ دروازہ بند ہونے کے ایام میں یہ بھی اندر رہ کر حضرت اقدس کی طرح صوم کامل رکھتی تھی۔ اور کھانے پینے کے وقت انسانوں سے دور بیٹھتی تھی۔ جب تک کسی کھانے والی چیز کی طرف آنحضور اس کو اشارہ نہ کرتے۔ وہ کوئی چیز نہ کھاتی تھی حضرت سلطان الفقرا کو اس بلی کے ساتھ نہایت انس تھا۔ اکثر اوقات اس کو مخاطب کر کے معارف و حقائق کی باتیں

بیان فرمایا کرتے تھے۔ آخر پانچ سال حاضر خدمت رہ کر ایک دن اچانک غائب ہوگئی۔ اور پھر کسی کو اس کا حال معلوم نہیں ہوا۔

کُتے:

ایک کُتیا نے دو بچے دیئے۔ جو اکثر خلوت کدہ کے دروازہ پر آیا کرتے تھے۔ آنحضور بھی ان کی خوب پرورش فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دونوں سیر کوہسار میں بھی ہمراہ رہتے تھے۔ اکثر دفعہ جب حضور اقدس کو پہاڑ کی چوٹی پر نسوار کی ضرورت پڑتی تھی۔ تو موجود نہ ہونے کی صورت میں ایک کتا خالی بوتل منہ میں اٹھا کر صفاپور لے آتا تھا۔ اور کسی خادمِ درگاہ کے سامنے رکھ دیتا تھا۔ وہ بھی اس معمہ سے آگاہ تھے۔ فوراً بوتل میں نسوار ڈال کر ڈھکنا بند کرکے کتے کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اور وہ نہایت تیزی سے پہاڑ کی چوٹی پر حضرت اقدس کی خدمت میں پہنچا دیتا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے دنوں میں یہ دونوں بھی اندر ہی رہتے تھے۔ اور ایسی خاموشی اور سکون سے رہتے تھے۔ کہ دروازہ کھلنے تک کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ حضرت اقدس کے ساتھ برابر صوم رکھتے تھے۔ پانچ سال سے زیادہ عرصہ یہ دونوں حاضر خدمت رہے۔ آخر ایک دن ایک اجنبی جو بظاہر دیوانہ تو نہ تھا۔ مگر اس کی ایک ہی نگاہ سے یہ دونوں کتے بیمار ہوگئے۔ ایک کتا حضور اقدس کے قدموں کے سامنے ہی مر گیا۔ دوسرے کو انگشت مبارک سے کوہِ ہلدّر کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ اِسی اشارہ پر کوہ ہلدر کی جانب جا کر ہمیشہ کے لئے نظروں سے غائب ہوگیا۔

شیر:

بارہا حضرت اقدس کے خلوت خانے کے نزدیک رات کے وقت شیر کے گرجنے کی آواز سنا کرتے تھے۔ سینکڑوں معتبر اشخاص اس واقعہ کی تصدیق وتائید کرتے ہیں۔ مگر ایسے صرف دو تین ہی آدمی ہیں۔ جنہوں نے شیر کو بچشم خود دیکھا ہے۔

ایک دفعہ ایک خادم نے رات کے دس بجے زیارت حضور اقدس کی خواہش کی۔ تو دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ پس وہ مشرقی دریچہ کی طرف چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شیر پچھلے پاؤں پر دریچہ کے ساتھ منہ لگا کر کھڑا ہے خادم کے نزدیک جانے پر زور سے غرّ ایا۔ خادم ایک بے اختیار چیخ کے ساتھ زمین پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔ آواز سُن کر چند آدمی وہاں جمع ہوئے ابھی تک شیر بدستور کھڑا تھا۔ آخر لوگوں کے شوروشر سے بھاگ گیا۔

اسی طرح ایک اور خادم رات کے وقت کوئی چیز لے کر آیا۔ تو اس نے ایک شیر کو خلوت کدے کے دروازے پر دیکھا جو اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ شب کی تاریکی میں پہلے تو اس نے خیال کیا کہ کوئی کُتا ہے۔ مگر جب روشنی سے دیکھا کہ یہ شیر ہے۔ تو اس کے ہوش وحواس اُڑ گئے۔ اور پسینہ پسینہ ہوگیا۔ حضور اقدس نے فرمایا ''گھبراؤ مت! یہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا یہ سَیاح اور مسافر ہے!! پھر شیر کو مخاطب کر کے فرمایا'' جاؤ خدا کے حوالے اس طرح یہاں مت آیا کرو۔ یہ لوگ ڈر جاتے ہیں''۔ اتنا سنکر شیر چلا گیا۔

ایک دفعہ ایام بہار میں حضور اقدس حسب معمول بلاخورد ونوش علے

الصباح کوہ ہلدر پر تشریف لے گئے تھے۔ایک خادم دوپہر کے وقت کسی قدر کھانا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔کافی تلاش اور جستجو سے اس نے آنحضور کو ایک ہموار پتھر پر اس طرح لیٹے ہوئے پایا کہ ان کے سرہانے ایک اور پاؤں کی طرف دو شیر بیٹھے ہوئے ہیں۔ان کی غضب ناک نظر اور بالاتفاق غراہٹ سے خادم الٹے پاؤں ایسی بدحواسی سے بھاگا۔کہ اسکو صفاپور تک اپنے آپ کی کوئی خبر نہ رہی۔لوگوں نے دیکھا کہ اس کے پاؤں سے خون جاری ہیں۔اور اس کے بدن کے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد ہوش سنبھال کر اس نے تمام ماجرا بیان کیا۔

جناب پیر غیاث الدّین شاہ صاحب کے خلف الرشید پیر نور الدّین شاہ صاحب ایام خوردسالی میں ایک دفعہ رات کے وقت ایک آدمی کے ہمراہ پیدل صفاپور جارہے تھے۔رات کے درمیانی حصہ میں گاؤں کے باہر جھیل مانسبل کے کنارے پر راستہ کے ایک طرف ان کو ایک شیر نظر آیا۔جس نے خلوت کدہ خاص تک (تقریباً آدھ میل تک) راستہ کے دائیں طرف کسی قدر فاصلہ پر رہ کر ان کا ساتھ دیا۔اور دروازہ سے واپس لوٹ گیا۔چونکہ نور الدین شاہ صاحب کو سخت خوف طاری ہوا تھا۔اور تمام اعضاء لرزاں و عرق ریز تھے۔حضرت سُلطان الفُقراء نے ان کو نہایت پیار سے گلے لگایا اور فرمایا کہ گھبرانا نہیں چاہیے جو میرے عزیز ہیں، صحرائی درندے اور شیر بیابان ان کا اعزاز کرتے ہیں۔اور ان کے ہمراہ رہ کر رادلی کا کام کرتے ہیں۔

❀❀❀

عُرس حضرت سُلطانُ الفُقراء

چونکہ حضرت سُلطان الفُقراء کی وفات حسرت آیات کا جانفرسا صدمہ اوّل ربیع الاول ۱۲۳۴ھ کو پیش آیا۔ اس لئے ہر سال اس تاریخ پر سالانہ عرس ہوتا ہے۔ لیکن حضور اقدس کے عام مریدین و معتقدین اس تقریب پر یہاں جمع نہیں ہوسکتے۔ صرف ملحقہ دیہات اور نزدیک علاقہ کے بعض قدیمی ارادت مندان درگاہ رحیمی میں جمع ہوتے ہیں۔ اور رات کے دس بجے تک قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد قرآن خوان اور عام حاضرین کو (جن کی تعداد چار پانچ سو تک ہوتی ہے) کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اور رات کو معمولی چراغان کے علاوہ اور کوئی نمائش نہیں کی جاتی۔

حضور اقدس کی رحلت پر بوجہ موسم سرما کے کوئی ایسا اجتماعی ماتمی جلسہ نہیں ہوا۔ جس پر کشمیر کے ہر ایک علاقہ سے آپ کے تمام اخلاصمند، مرید اور جان نثار عاشق بالاتفاق جمع ہوتے۔ اگرچہ فرداً فرداً ایک ایک علاقہ یا گاؤں یا محلّہ کی ایک ایک پارٹی نے اپنا اپنا جلسہ منایا۔ اور یہ سلسلہ برابر چالیس یوم تک جاری رہا۔ مگر کوئی عام جلسہ منعقد نہیں ہوا۔ آخر ساڑھے پانچ

ماہ کا عرصہ گذرنے پر موسم گرما میں زیر صدارت جناب پیر غیاث الدین شاہ صاحب مدظلہ العالی بتاریخ ۱۴ ماہ بھادوں کشمیری مطابق ۱۴ ماہ شعبان المعظم ۱۲۳۴ھ ہجری المقدس سب سے پہلا جلسہ روضہ رحیم پر نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس جلسہ کی تیاری کا پہلے سے انتظام ہو چکا تھا۔ اس لئے تمام کشمیر سے دلدادگان کوئے رحیمی بکثرت اس تقریب پر جمع ہوئے۔ آئندہ کے لئے یہی تاریخ سالانہ جلسہ کے واسطے مقرر ہوئی۔ چونکہ کشمیری سنہ اور تاریخ کا رواج نہیں رہا۔ بلکہ کشمیر میں بھی بہت کم اہل قلم اس سے واقف ہیں اس لئے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ماہ ساون ہندی میں چاند کی چودھویں تاریخ کو یہ جلسہ ہوا کرتا ہے۔

فی الحال جلسہ اس طریقے پر انجام ہوتا ہے کہ ۱۳ تاریخ کی شام سے مقبرہ مقدس پر ختم خوانی شروع کی جاتی ہے۔ جو دس بجے شب کے قریب پُر درد نعت خوانی سے اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس کے بعد مولوی احمد اللہ صاحب کرالہ واری کشمیری (جو عالم و فاضل ہونے کے علاوہ علم قرأت میں ممتاز ہیں) قرآن مجید کی چند آیات بلحن دلکش پڑھ کر سناتے ہیں جس سے حاضرین و سامعین نہایت محظوظ و مسرور ہوتے ہیں۔ پھر انہی آیات بابرکات کی تفسیر پر چار پانچ گھنٹے وعظ فرماتے ہیں۔ دو تین بجے رات کو حکیم احمد شاہ صاحب کھوسہ پوری (برادرزادہ جناب پیر غیاث الدین شاہ صاحب) مولودخوانی شروع کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ خوش گلو نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت ہوتی ہے۔ چیدہ چیدہ اور مؤثر نعتیہ غزلوں سے مخموران بادہ

رحیمی رقص میں آتے ہیں۔ جس سے دشت وجبل گونج اُٹھتے ہیں۔ صبح کی نماز تک یہی مستانہ جوش وخروش رہتا ہے۔

مرقد مقدس کے اندر اور باہر گرداگرد رات کو کافوری شمعوں اور تیل کے چراغوں سے چراغاں ہوتا ہے۔ ادھر رات بھر ضیافت تیار ہوتی ہے اور بعد نماز صبح عام حاضرین کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد عام کھیل تماشے دن بھر کے واسطے شروع ہوتے ہیں۔ اور مختلف قسم کے گانے والے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں کشمیری بھانڈوں کے فن کا مظاہرہ پُر زور ہوتا ہے یہ لوگ موضع ہانجی گنڈ (واتھور) کے باشندے ہیں۔ اور انکا کافی وقت سے اس دربار کے ساتھ تعلق جاری ہے۔ اسی تعلق سے غلام محمد بھگت (بھانڈ) کی سربراہی میں ساٹھ ستر آدمیوں کی ایک جماعت یہاں آتی ہے۔ اور دن بھر یہ لوگ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پانچ بجے شام کے قریب جلسہ ختم ہوتا ہے۔ اور لوگ واپسی کا ارادہ کرتے ہیں حاضرین کی کل تعداد دس بارہ ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔

چونکہ جلسہ کا موسم زیادہ تر سیر وتفریح کا موسم ہے۔ اور صفا پور تک راستہ دریائی ہے۔ اس لئے راہِ روان راہِ رحیمی کے علاوہ عام تماشہ بین بھی یہاں بکثرت آتے ہیں۔



ختم حضرت سُلطانُ الفُقراء

اب یہاں حضرت تاج الاولیاء۔ سُلطان الفُقراء بادشاہ بحروبر کا ختم شریف درج کیا جاتا ہے۔ جو جناب پیر غیاثؒ الدّین شاہ صاحب کے ارشاد سے تجویز ہوا ہے۔ یہ ختم ہر سالانہ عرس اور سالانہ جلسہ پر پڑھا جاتا ہے۔ اور آنخصور کے مریدان و معتقدان اپنے اپنے گھروں پر بھی مشکلات کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔ یہ ختم شریف حل مشکلات کے واسطے اکسیر اعظم اور نسخہ مجرب ہے۔

اوّل درود شریف

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنا وَمَوْلٰینا مُحمّدٍ وَّ عَلٰی آلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰینَا مُحَمّدٍ. (چہل و یک بار (۴۱ رمرتبہ)

تسمیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم (سہ صد و چہل و یکبار) ۳۴۱ مرتبہ

آخر درود شریف

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنا وَمَوْلٰینا مُحمّدٍ وَّ عَلٰی آلِ

سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ. (چہل و یکبار ۴۱ مرتبہ)

دعا بر خاتمہ

اب میں ''حیات رحیم'' کو اس التجا کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

مظہرِ شانِ رحیمی المدد

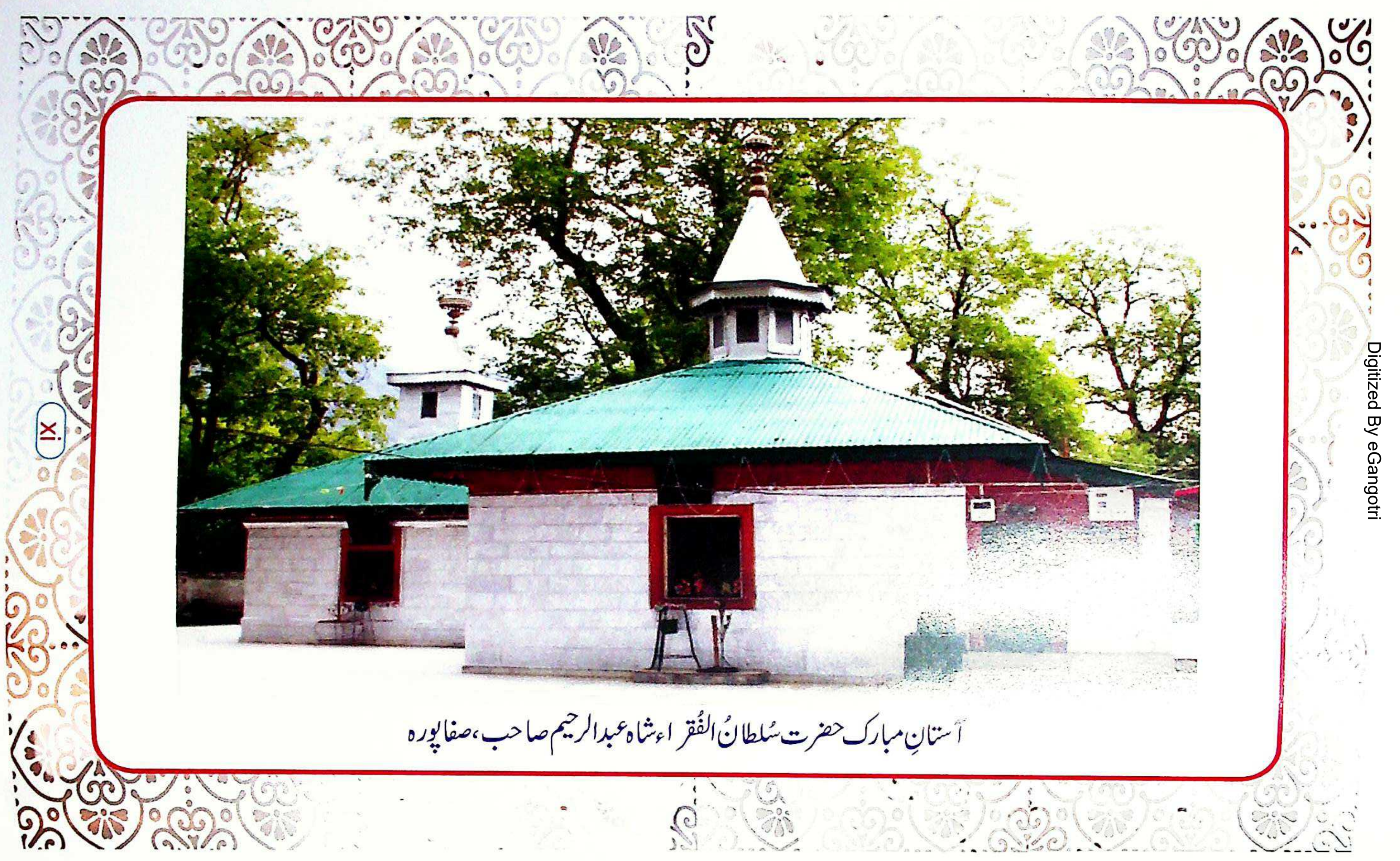
قاسمِ خوانِ کریمی المدد

(بالخیر)

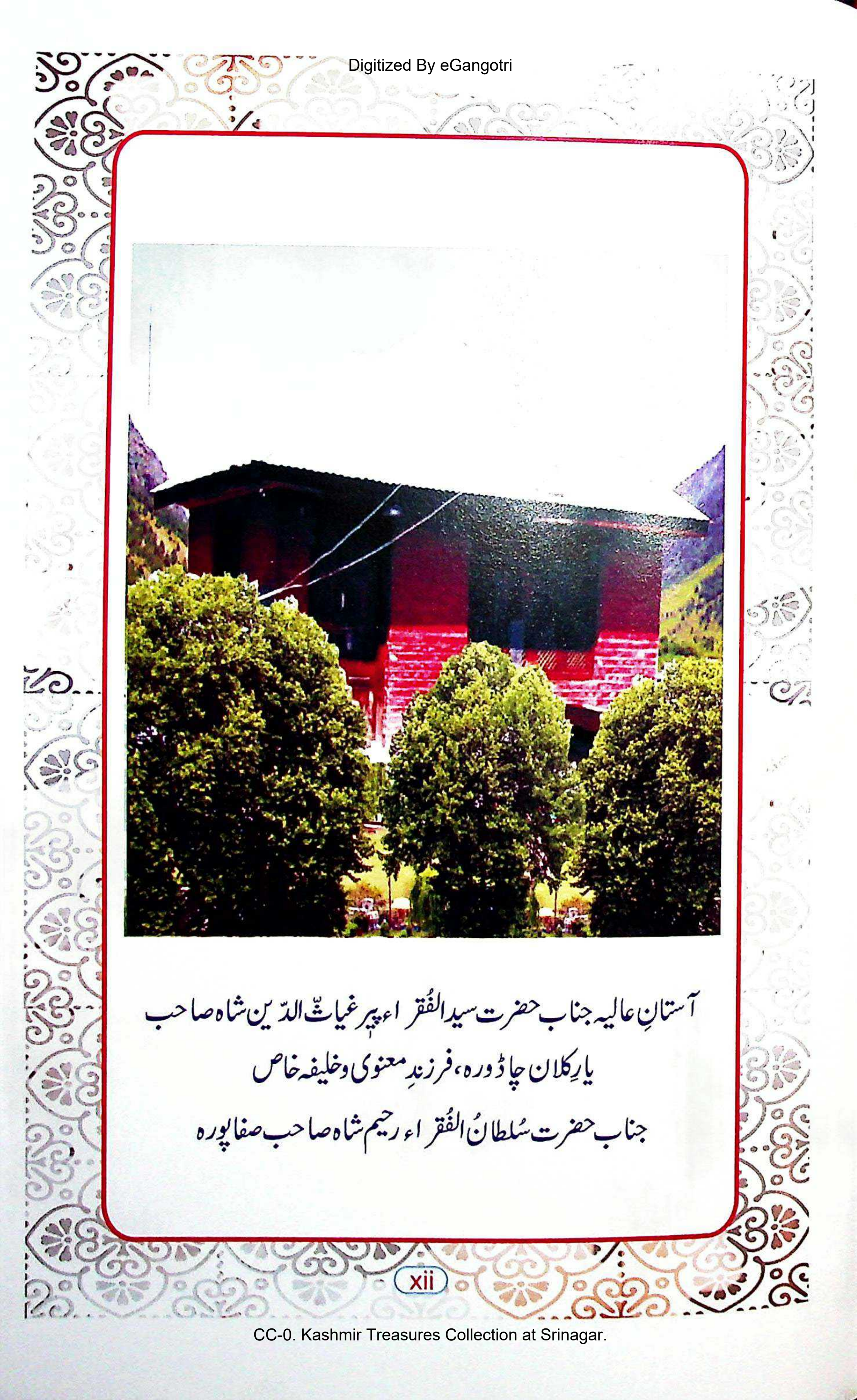




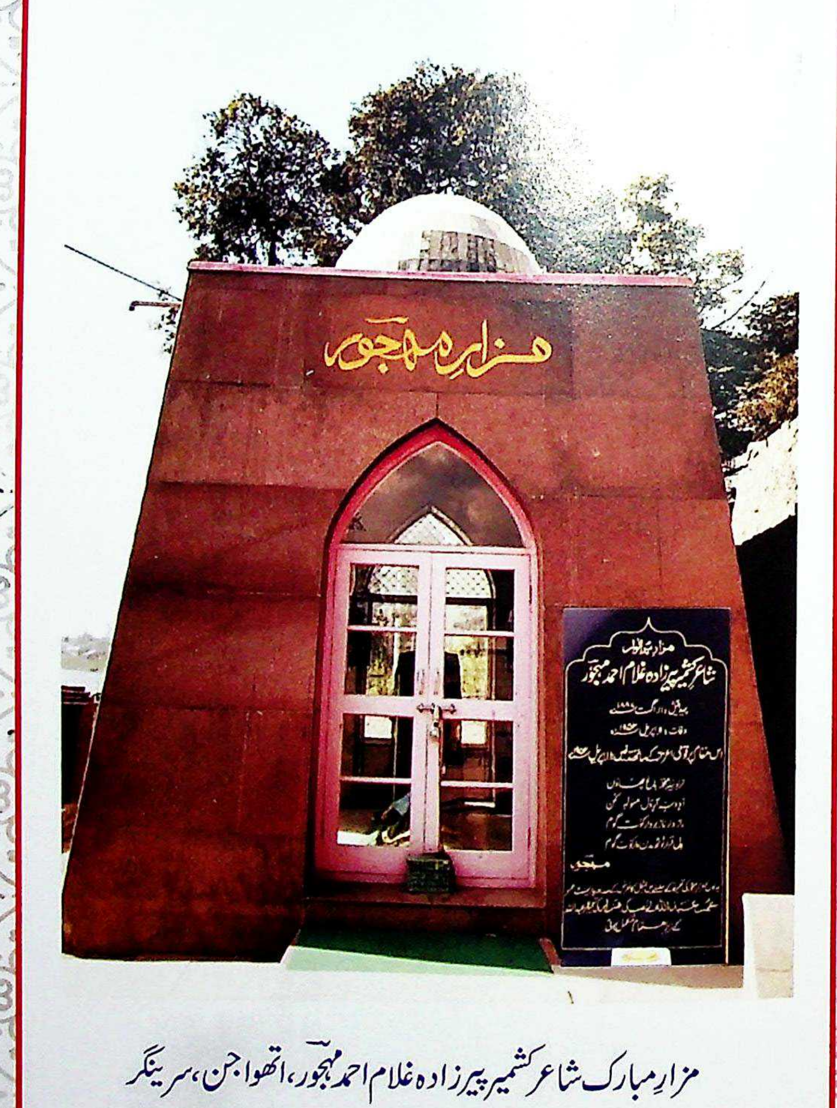
باب چهارم



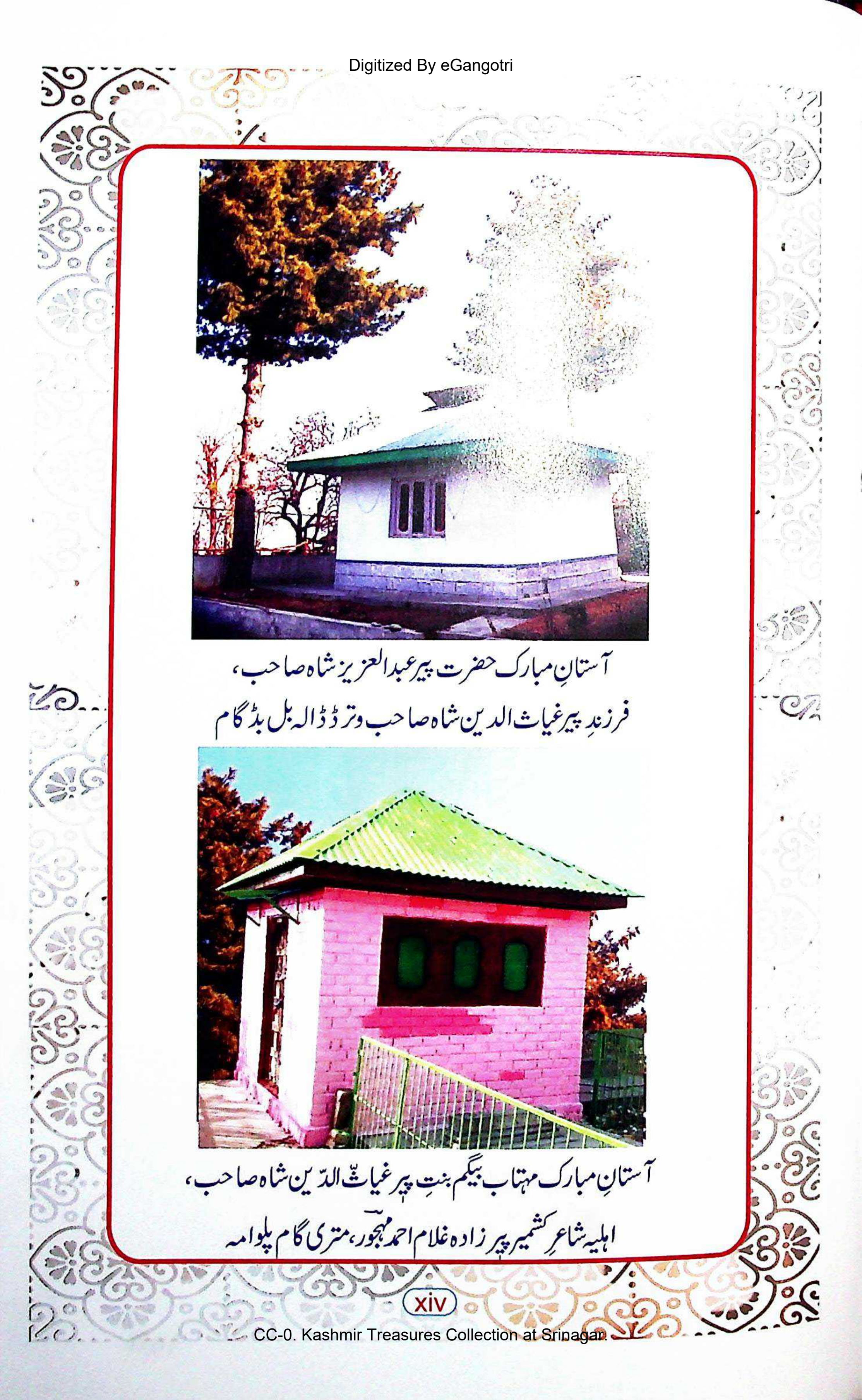
آستانِ مبارک حضرت سُلطانُ الفُقراءشاہ عبدالرحیم صاحب، صفاپورہ



آستانِ عالیہ جناب حضرت سید الفُقرا ءپیر غیاثؒ الدّین شاہ صاحب
یارِ کلان چاڈورہ، فرزندِ معنوی وخلیفہ خاص
جناب حضرت سُلطانُ الفُقرا ء رحیم شاہ صاحب صفاپورہ



مزارِ مبارک شاعرِ کشمیر پیرزادہ غلام احمد مہجورؔ، اتھواجن، سرینگر



آستانِ مبارک حضرت پیر عبدالعزیز شاہ صاحب،
فرزندِ پیر غیاث الدین شاہ صاحب وترڈالہ بل بڈگام

آستانِ مبارک مہتاب بیگم بنتِ پیر غیاثؒ الدّین شاہ صاحب،
اہلیہ شاعرِ کشمیر پیر زادہ غلام احمد مہجورؔ، متری گام پلوامہ

نذرانۂ عقیدت

حضرت مہجورؔ کا تحریر کردہ مندرجہ ذیل نذرانۂ عقیدت، جو انہوں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں تحریر کیا ہے۔ واضح رہے کہ حضرت اقدسؒ کے خلیفۂ خاص حضرت پیر غیاث الدّین شاہ صاحب یارِ کلان نے اپنی دختر نیک اختر کو حضرت مہجورؔ کے نکاح میں دی۔ اگرچہ مہجورؔ صاحب نے ۵۰/اشعار پر مشتمل فارسی زبان میں ''نالۂ مہجورؔ'' کے عُنوان سے نذرانۂ عقیدت تحریر کیا ہے۔ تاہم کشمیری زبان میں بھی مہجورؔ صاحب نے حضرت اقدسؒ کی شان میں عشق و محبت سے لبریز یہ نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے:



آس بَر تَل کاس خاًری بوز زاًری یا رحیم
بَر تہٕ دِل اَز نوٗرِ عرفان گر تہٕ یاًری یا رحیم

چھُکھ بلا شک مالکِ کون و مکان شاہِ شاہان
چھےٚ شوبان دون عالَمن ہٕنز تاج داًری یا رحیم

اعجزٕن پیٹھ رحم کَر چھےٚ رحمتک دٕریاو ژٕے ناو
اسمِ پاکس چانٕہ سےٚ لگےٚ پاًری پاًری یا رحیم

سر زمینِ دِل گوٚمُت پژٕ مُردٕ اَز جرم و خطا
رحمتُک باراں اَسہِ پیٹھ تھاو جأری یا رحیم

اَکھ نظر کر رٕچھ سأنی گژھن غم غوصہٕ دوٗر
ڈیڈِ تَل آمتی چھِ بااُمید سأری یا رحیم

غم مےٚ کیٛاہ چھُم در جہاں چھُس چانہٕ دربارُک گدا
نأکِ چأنی رز گَیم از فضلِ بأری یا رحیم

کُری سبٹھاہ بدکار اَسہِ گرزون کیٛاہ گوٚ نیک وبد
پیے زِنخوت گے پریشان وأنژ خأری یا رحیم

چشمِ بادامو نظر کر سَر ژٕ تُل اَز خوابِ ناز
اَکھ دَما وُچھ عاشقن ہٕنز بے کرأری یا رحیم

الغیاث اے پادشاہِ دین و دنیا الغیاث
رات تہٕ دوہ چھی وَنان با آہ وزأری یا رحیم

چانہٕ وَتہٕ ہٕنز گردِ پَتھ گومُت فدا جانِ عزیز
بہر للہ کر قبوٗل سأنی جانثأری یا رحیم

دَکہٕ زَد مہجوٗر آمُت ڈیڈِ تَل بوزُس صدا
فضلہٕ چانٛچ چھس سبٹھاہ اُمیدوأری یا رحیم

❁❁❁

نذرانۂ عقیدت حضرت پیر عبدالعزیز شاہ

حضرت سیّد الفقراء پیر غیاث الدّین شاہ صاحبؒ جنہیں حضرت اقدس جناب بادشاہِ رحیمؒ کے معنوی فرزند اور خلیفۂ خاص ہونے کا شرف حاصل ہے، کے یہاں دو فرزندار جمند اور ایک صاحب زادی پیدا ہوئے۔ بڑے صاحبزادے کا اسم گرامی پیر عبدالعزیز شاہ صاحبؒ، دوسرے کا پیر نورالدّین شاہ صاحبؒ اور صاحبزادی کا نام مہتاب بیگم تھا، جو بعد میں حضرت مہجورؔ صاحب کے عُقد میں آگئیں۔ مگر فطرتاً درویش صفت خاتون تھیں۔ حضرت پیر غیاث الدّین شاہ صاحبؒ اپنے اولادوں کو لے کر اکثر دربارِ رحیمی میں حاضر ہوا کرتے اور جب سُلطان الفُقراء سے ان کے حق میں دُعا کرنے کی خواہش ظاہر کی تو جواباً حضرت اقدس نے فرمایا:

"آنان کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
سگ را ولی کنند مگس را ہُما کنند"

حضرت پیر عبدالعزیز شاہ صاحبؒ نے اپنے پیر و مُرشد جناب حضرت اقدسؒ کی محبت اور عقیدت میں کئی مناقب کہے ہیں جس میں اُن کی

شیرین کلامی، شگفتگی، عشق و محبت کی چاشنی اور آپ کی حضرت اقدسؒ کے تئیں عقیدت کی شدت نمایاں نظر آتی ہے۔ حضرت اقدس کی بارگاہ میں آپ کا متذکرہ بالا نذرانۂ عقیدت بہ طور تبرک نقل کیا گیا ہے۔



زِ اعمالِ بد چھُم دِل دونیم　　کر رحم برمَن یا رحیم

رحمت چھےٚ چانی بے عدد　　تتھ رحمتس گُنہِ چھےٚ نہ حد
ژےٚ چھکھ غفور و ژے رحیم　　کر رحم برمَن یا رحیم

بے کس بہ چھُس پیومُت پتھر　　ربّا میہ کُن کر اکھ نظر
سرِ راہ چھُسے پیومُت یتیم　　کر رحم برمن یا رحیم

پننبوٚ بو ترووس سر بسر　　اے چارِ گر ژے چارِ کر
ونہ گس ژٔےٚ روستےٚ چھُکھ کریم　　کر رحم برمَن یا رحیم

سینہ دَودُم مے در فراق　　جگرس گٔمتؠ چھِم چاک چاک
دِل غم ہتی چھُم ندیم　　کر رحم برمَن یا رحیم

اُوْنمے وسیلہ مُرسلینؐ سردار سید العالمینؐ
ایماں بخشتم اے کریم کر رحم برمَن یا رحیم

از کاربد چھم دِل سیاہ مند چھان چھُس بو گرٕ کیاہ
پژاران فَھلس مُستقیم کر رحم برمَن یا رحیم

یم دأ دِٕ أندریم کس ونے دفتر پٔنٕ ژے نش اَنے
دادبن چھِھم ژٕے مے حکیم کر رحم برمَن یا رحیم

عزیزہ منگ تس سرورس اصلُک ہدایت رہبرس
رحمت رحیمس چھے غنیم کر رحم برمَن یا رحیم



نذرانۂ عقیدت

یہ چند دلکش اشعار خامۂ سحر آمیز حضرت پیر نورالدین شاہ صاحبؒ یارِ کلان بن سعید الفقراء حضرت پیر غیاث الدّین شاہ صاحبؒ قبلہ کی ایک یادگار متصوّفانہ غزل سے ماخوذ ہیں۔ حضرت پیر نورالدّین شاہ صاحبؒ نے جو عیار تخلص کرتے تھے، یہ اشعار حضرت اقدسؒ کے وصال و فراق میں تحریر فرمائے ہیں اور آپ حضرت اقدسؒ کے چہیتے، فیض یافتہ عاشق اور فدوی رہے ہیں۔ اکثر دربارِ رحیمی کے خاص و عام میں محفلِ سماع منعقد فرماتے اور خود بھی شریکِ محفل رہا کرتے تھے۔ یہ عقیدت مندانہ اشعار اُنہی مبارک محفلوں کی ایک یادگار ہے جو قارئین حضرات کے جذبۂ عقیدت کو مزید جلا بخشنے کے لئے یہاں درج کئے جاتے ہیں:



(کلامِ حضرت پیر نورالدّین شاہ صاحب)

ژٕورِ ژٕوٕرے نامہٕ سوزَے دیدٕ گاشر دِلبرو
دٕ رِدٕرے وُچھنہٕ رُوزے اَژھ تہ ییمہٕ بَرٕ دِلبرو

سُور کٕرنم دٕ رِرن چانٕی کونہ چھے انصاف ژے
گرِ کیا بو شرٕ چانے بال مامرٕ دِلبرو

لولہٕ وأنٛج آیہ پھٹنس چُھم نہ کھٹنس وار مے
کوٗت کالاہ ژالہٕ دوٗربر ہا ستم گرٕ دِلبرو

سالہٕ پکھنا بالہٕ یارو چال وُچھنے نیر ہے
چانہٕ باپتھ خأکی مالہٕ تہ موختہ ہا جرٕ دِلبرو

آفتابو جوشہ چانے میأنی وأنٛج گیہ گباب
چھوٕ شرابِ جلوٕہ چشمو زوٗن لجی دَرٕ دِلبرو

برأنزی چانے بوژہ پاسے لیل دَرایس ؤنی دِوان
گامہ شہرے کوچہٕ بازٕر گرٕ پتھ گرٕ دِلبرو

خونِ دِل ستی نامہ لیٛو کھمے میون مطلب گری زِیوٗر
کرانہٕ درایس مایہ چانے ونتہ کیاہ گرٕ دِلبرو

عشقہ سٔدرَس منز عیارٔس وُچھ چھِ گأمژ ہیرٕ ناو
وارٕ وتم ویرٕ چانے تارٕ کمہٕ ترٕ دِلبرو



شانِ رحیمی

جناب حضرت سُلطان الفُقر اء شاہ عبدلرحیم صاحب کے خلیفہٗ خاص جناب سید الفُقر اء پیر غیاثؒ الدّین شاہ صاحب کے خانہ وادہ سے آج کی پیڑی میں اُن کا پڑپوتا پیر زادہ بشیر الحق موجودہ دور میں حضرت اقدس کے دربار کا نہ صرف شیدائی و فدوی ہے بلکہ دربارِ رحیمیؒ سے اُن کی والہانہ عقیدت و محبت ہی اُن کا سرمایۂ زندگی ہے۔ آپ حضرت عقدس کے سرِ فہرست مدح سراؤں اور منقبت خانوں میں شامل ہیں بلکہ آپ نے حضرت عقدس کی مدحت میں سینکڑوں اشعار دربارِ رحیمی کی نذر کئے ہیں۔ جن میں اُن کی مقبول ترین منقبت ''شان رحیمیؒ'' واقعی بے مثال ہے، جو بشیر الحق صاحب نے حضرت اقدس کی عظمت اور حیاتِ مبارکہ کے تعارف میں نہ صرف نذرانۂ عقیدت کے طور پیش کی ہے بلکہ اس طرح سے وہ اپنے

اسلاف کی قائم کردہ اس روایت اور روحانی میراث کی آبیاری کرتے اور آگے بھی لے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل منقبت ''حیاتِ رحیم'' کا کشمیری زبان میں منظوم تلخیص مانا جاسکتا ہے:



(کلامِ پیرزادہ بشیر الحق)

دِمے ہا غنیمتھ پأدِ گر زان شانِ رحیمی بالا شان
عأرفن معرفت با گر اوان شانِ رحیمی بالا شان

صفا پورِ تھنہٕ یێلہِ پیۆ و سُلطان عالم عالم گۆو پڑزلان
زٕ ژٕ آسہٕ ہلدرر کوہَس پیۆان شانِ رحیمی بالا شان

شُری پانہٕ پیٹھے أسی کم بولان اللہ اللہ وردِ زبان
آثارے فقیری أسِکھ عیان شانِ رحیمی بالا شان

لۆکھ أسی بیۆن بیۆنُے معنے کران تعبیر پنن خابن وُچھان
فقیر گرِ فقیرا عالیشان شانِ رحیمی بالا شان

دوہہ کھوتہٕ دوہہ گیہِ شہرٕتھ ہُران کرامژ واراہ یێلہِ گیہِ ننان
أنڈی پکی لۆکھ گیہِ جماہ سپدان شانِ رحیمی بالا شان

عامَن تہٕ خاصَن ہٕنٛدی سا یبان   پڑ بتھ کأنٛسہِ دِل اُسی رَنٛزناوان
تختہٕ کُتھِ شاہ اوس جلوہ ہاوان   شانِ رحیمی بالا شان

وقتکی حکمران اُسس نمان   شیرِ نَر اُسس شانہٕ داران
غوث تَے ابدال تتہِ ڈیڈوان   شانِ رحیمی بالا شان

شکل و شمائِل کیاہ کرِ بیان   تھر تھر جِسمَس زِو چھم گلان
آفتاب زَن اوس گاہ تژاوان   شانِ رحیمی بالا شان

رویے نازنینَس نۆر پرزلان   مویے پاک شانَن پتھ اَویزن
حۆرِ آسہٕ مویَس شانہٕ کران   شانِ رحیمی بالا شان

تَمہِ شکلہِ کأنٛہہ چھُنہٕ نظرے گژھان   پی اوس پیر اَسہِ فرماوان
پیرِ ہنٛز کتھ چھم وِردِ زبان   شانِ رحیمی بالا شان

ساز سنطورک اُسی بوزان   کُنہِ کُنہِ سیتار پانٛئے رٹان
تَمہِ سوزٕ دٕدی ہتی دِل شیٛہلان   شانِ رحیمی بالا شان

اکثر خلوَتھے اُسی روزان   تختس درواژٕ بند تھاوان
مکان اُسیا کِنہٕ آسی لامکاں   شانِ رحیمی بالا شان

یارِ پٔژھٕ یار اوس یٖیلہِ واتان تختس درواز یَلہٕ تڑاوان
نۆر اوس نۆرَس پأراوان شانِ رحیمی بالا شان

جناب غیاسَس لولاہ بران ٹأٹھنیارِ گویا کٔر صأب أسی ونان
راز و نیازِ چہ کتھہٕ وبڑھنان شانِ رحیمی بالا شان

گاہ کھٔسِتھ شیرَس أسی نیران ہلدر کوہَس ژھالہٕ ماران
تَتہِ گُس اوس تَے گَس سمکھان شانِ رحیمی بالا شان

نظرِ ستی خاکس سۆن سپنان بچھہٕ وِنی تَتہِ نَس شاہ گیٖر بنان
کرامژ گنزرنس عاجز زبان شانِ رحیمی بالا شان

سحر خیزی ہُنْد تھوٗکھ فرمان کوکرِ سنزِ بانگہِ بڑوٗنہہ ووتھنُے جان
صاف دِل پاک چشم سچی زبان شانِ رحیمی بالا شان

اَتہِ اور دفتر گڑھہِ زیٹھان حبس گر عاشقو ژھوٚٹ کر بیان
محرم کارَن سورُے عیان شانِ رحیمی بالا شان

پیرِ کتھہٕ بشیرو چھکُھ وبڑھنان اسم اعظمَس للہٕ ناوان
خوش روز شہنشاہ گوٗے مہربان شانِ رحیمی بالا شان

❀❀❀



انجاؔن کشمیری بھی حضرت اقدس کے دربار کا نہ صرف شیدائی اور فِدوی ہے بلکہ انہیں دربارِ رحیمیؒ سے گہری عقیدت اور والہانہ عشق ہے۔ ''نالہ انجاؔن (بدرگاہِ رحیمیؒ)'' عنوان سے انجاؔن صاحب نے حضرت اقدس کی عظمت اور تعریف میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''نالۂ انجاؔن (بدرگاہِ رحیمیؒ)''

رحیما! ژلبم شر مدد کر مدد کر
گدا چُھس مُژر بَر مدد کر مدد کر

ژٕ چُھکھ بادشاہ کینٛہہ مے راہِ خدادِم
ژٕ چُھکھ میون یاور مدد کر مدد کر

چلان حکُم چونُے چھ دوٚن عالمن منٛز
ڈران ییٚتہِ چھِ ششدَر مدد کر مدد کر

تھکِتھ دأدٕ لَدییٚلِہ یوان ڈیڈِ تل چھی
بَلان یم چھِ یکسر مدد کر مدد کر

اَلان طوٗر وٚنہِ آسہِ تمہِ نوٗرٕ زٕ ژٕ ستی
ڈلان ماچھُ ہلدر مدد کر مدد کر

ژٕ چھکُھ مأ لک لوح قلم از قلم تل
گوٚمُت چھس بہ ابتر مدد کر مدد کر

نٔے چیو شیرِ کنہٕ دوہے نامِ غیأثی — موٗ دُر میوٚٹھ کوثر مدد کر مدد کر
بہٕ قطرن کرے کیاہ بہٕ چھُس تشنہٕ آغو — ژٕے تابع سمندر مدد کر مدد کر

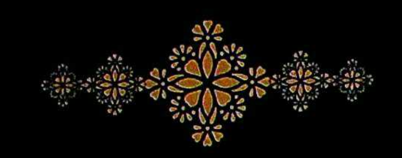
صفا پور جأری وُچھِم چأنی رحمت — مے ازلَس ژہ لبم وَر مدد کر مدد کر
یِوان درشنَس یور عاؔرف تہٕ سلطان — وُچھان رویہِ انور مدد کر مدد کر

پتھر چھُس پیوٚمُت یوٚژے روٗس گُس تُلبم تھوٚد — نہٕ چھُم مال تَے زر مدد کر مدد کر
اگر فضلہٕ گنجَس ژٕ درواز مُژرَکھ — یِنَم با خدا پَر مدد گر مدد کر

شفیع ہیتھ بہٕ آسَے پٕنُن پیرِ رہبر — فدا ژٕینٔ گرَے سر مدد کر مدد کر
متمن تَے فقیرَن ہُنڈُے بادشاہ چھُکھ — وہ تھان یِنہٕ قلندر مدد کر مدد کر

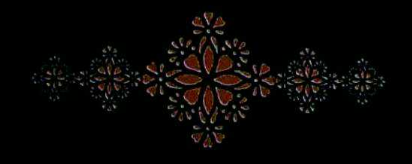
نٔے وتربڈ، ہِتر گامہٕ چونٔے بجر سوٚر — خطا در گُذر کر مدد کر مدد کر
تُلِتھ ویوٚر مہجور گوٚو چانہِ باغُک — چُھ انجانؔ لاگر مدد کر مدد کر





''عشقِ حقیقی آب وگُل کی قید سے مستثنیٰ
ہے۔ ناپائیدار رنگوں سے اپنے آپ کو
رنگین مت کرو۔ وہ رنگ اختیار کرو جس
کو دنیا کا کوئی پانی یا دھوپ کمزور یا
ضائع نہ کرے۔ دل کو خراب مت کرو
اور صاحب دل کے سوا کسی کے آگے سر
خم مت کرو۔''

فرمانِ سلطان الفقراء



'Hayat-e-Raheem'

Shayir-e-Kashmir Peerzada Ghulam Ahmad Mahjoor (1887-1952), a Poet par-excellence and precursor of literary Renaissance in the Valley has impacted Kashmiri language by augmenting its vocabulary and idiom so refreshingly, immensely and profoundly that he continues to be a household name in Kashmir even after his death several decades ago.

Besides his poetry, **Mahjoor** is acclaimed for his scintillating prose through which he made untiring endeavours to define elaborately and meaningfully various contours of Kashmiri identity and culture with their definite spiritual, humanistic and inclusive overtones. He chose Urdu prosaic diction for this noble, mountain-climbing venture and explicated our Civilizational mosaic and Sufi and Rishi dispositions in all their shades with loving care, adroitness, skill and authenticity.

His exhilarating book: **Hayat-e-Raheem**, whose first printed copy was perused with delight and appreciation by **Sir Mohammad Iqbal**, the Poet of the East, and the second edition of which is seeing the light after about a century, is the classical example of his extraordinary writings on Kashmir's spiritual journey from early to medieaval to modern times. Through a detailed discourse on the life and times of **Raheem Sahib,** the Sufi Saint of highest order, it takes our pluralistic ethos--a unique blend of Hindu, Buddhist, Muslim thought and Sufism-- across the lofty mountains of Kashmir to the world beyond to earn for us a significant space in the Subcontinental history. He proclaims it, and rightly so, as an undetachable ingredient and effervescent aspect of our social ecology within which our identity operates vibrantly to make Kashmir a real abode of humanism and repository of profound spirituality.

What makes Kashmir glaringly a distinct Civilization in the whole range of Asiatic Civilizations is the Messianic nature of its sacral entity and vivaciousness of its ethos? Essentially springing from our shared legacy and manifesting itself through a huge assortment of **Shrines, Khankahas** and **Dargahas**, spread all over the Valley, these unique attributes of Kashmir are engrossing enough to make it, as **Mahjoor** believes, the **"Ghaar-e-Hira'** of the East; a Spiritual Paradise on earth that is more luminous than its scenic beauty for which it is so widely known as heaven on Earth.

Essentially a biography of **Raheem Sahib, Mahjoor's** contemporary **Saint** of great spiritual merit and accomplishments, the book contains a treasure of truly sublime stuff about the miseries that had befallen Kashmiris in consequences of **Famines, Cholera, World War-1st** and unending official oppression and awful autocratic dispensation. Its pages are full of events of historical importance which are so interesting that the reader doesn't want to leave them halfway unfinished. Its careful reading firmly establishes that if there was any genuine, honest, foresighted and high-minded Intellectual to voice the concerns of our ancestors and give vent to their collective angst and bring into world focus our Pluralistic Sufi Culture that has withstood the wicked, bitter centuries, it was undoubtedly the illustrious son of our soil, the **poet Mahjoor**

Dr. Abdul Ahad,
Historian, Author